جلد (۹) اپریل سنہ ۱۹۱۵ء نمبر (۱)

تمدن

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۵

معاشرتی تمدنی ادبی فلسفی اخلاقی تاریخی اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹر شیخ محمد اکرام بیرسٹرایٹ لا محمد عبدالراشد الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبدالرافع الخیری

قیمت سالانہ تین روپے | تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا | قیمت فی پرچہ ۵ر

کالیخان بیرسٹر

قوت کے لیئے ہماری نئی ایجاد

اگر آپ جھوٹے اشتہاروں سے بدظن ہو کر علاج سے تنگ ہو گئے ہوں
تو آخر میں اب ایک بار ہماری سفارش کو قبول فرمائیں اور ہماری
فارمیسی کی مشہور و معروف ادویہ

آتنک نگرہ گولیاں

کا استعمال فرمائیں۔ اور پھر مالک کی قدرت کا مشاہدہ کریں گئی ہوئی
جملہ طاقتیں از سر نو عود نہ کر آئیں تو ہمارا ذمہ صاحبو! اس کے
باب میں زمانہ کے معززین اصحاب تعریف فرما رہے ہیں لاکھوں
کی تعداد میں سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔ مردوں اور عورتوں کو دونوں
کو مفید نباتات سے مرکب ہیں قیمت بھی بہت کم ہے۔ صرف فی بکس

۳۲ گولیاں ایک روپیہ

آزمائش شرط ہے یکمشت چار روپے کے خریدار کو ایک روپیہ
کی دوا زیادہ ملے گی:۔

ویدشاستری جام نگر (کاٹھیاواڑ)

تمدن

انسان کے دشمن

"میمتھ" ایک خوفناک وحشی درندہ تھا، جو بہت قدیم زمانے میں روئے زمین پر موجود تھا، مگر اب اُسکی نسل دنیا سے ملیامیٹ ہوگئی ہے اُس کا پنجر زمین کے نہایت گہرے طبقات میں پایا جاتا ہے اور علمائے ارضیات نے اُسکو زمین کے جوف سے نکالکر عجائب خانوں میں رکھا ہے۔

اب سے پچاس ہزار سال پہلے یہ درندہ شمال یورپ کی دلدلی زمینوں میں کثرت سے پایا جاتا تھا۔ اسکے جسم پر لمبے لمبے بال تھے۔ دانت بڑے بڑے اور نہایت تیز تھے۔ ہاتھی کی طرح ایک سونڈ آگے لٹکتی تھی اُس میں بلا کی طاقت تھی۔ یہ خوفناک وحشی درندہ جب اپنے شکار پر حملہ کرتا تھا، تو اُس کے غصے سے کوئی انتہا نہ تھی۔

دم بھر کے لئے اُس زمانے کی تصویر آنکھوں کے سامنے لاؤ! جبکہ

اِن خوفناک درندوں کے غول سطحِ زمین پر پھرا کرتے تھے۔ وہ دیکھو سامنے ایک جھیل ہے، جس میں ایک وحشی انسان کمر کمر تک پانی میں کھڑا ہے۔ اُسکے لمبے سُرخ بال کمر تک لٹک رہے ہیں۔ اُسکے موٹے موٹے ہونٹ غصے سے ہل رہے ہیں۔ آنکھیں سُرخ ہوگئی ہیں۔ وہ دیکھو دانت نکالتا ہے اور دایاں ہاتھ بائیں کندھے پر بار بار مارتا ہے۔

یہ کیوں؟

یہ اسلئے کہ جھیل کی سطح پر مچھروں کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں اور وہ بار بار اُسکے کندھوں اور جسم کے دیگر حصّوں پر بیٹھتے اور کاٹتے ہیں جب کوئی مچھر اُسکو کاٹنا چاہتا ہے، تو وہ تاک کر ایک ایسا ہاتھ مارتا ہے کہ مچھر فوراً مر جاتا ہے۔

اگر تم حقیقت میں اُس زمانے میں موجود ہوتے اور اُس زمانے کے سُرخ بالوں والے انسان اور خوفناک میمتھ اور مچھروں کو دیکھتے، تو اُس انسان سے خطاب کر کے ضرور یہ کہتے:۔

"میرے دوست! تم مچھر کو بہت آسانی سے مار سکتے ہو اور شاید کسی زمانے میں مچھروں کی نسل کو دنیا سے غارت کر دوگے، مگر خوفناک میمتھ کے پنجے سے نجات پانا مشکل ہے۔ اُسپر غالب آنا دشوار ہے۔ اگر تم نے فتح پائی بھی، تو اِس کے لئے ہزاروں سال درکار ہیں۔

مگر تم حیران ہوگے اور دیکھوگے کہ تمہارا یہ خیال صحیح نہیں تھا۔ جو بات تم نے اُس زمانے کے وحشی انسان سے کہی تھی، وہ غلط تھی۔ میمتھ کی نسل دنیا سے معدوم ہوگئی۔ اب ایک میمتھ بھی روئے زمین پر نہیں پایا جاتا۔ میمتھ کی طرح اُس زمانے میں اور بھی بہت سے خوفناک درندے تھے۔ اُن کی نسلیں

بھی غارت ہوگئیں۔ تند اور خونخوار تیندوے جو یورپ کے شمال میں پھرا کرتے تھے، اب ناپید ہوگئے۔ بھیڑیوں کے غول کے غول تھے، جو برفانی منطقے سے نیچے تمام جنگلوں میں گھوما کرتے تھے۔ اب اُنکا نام و نشان بھی نہیں رہا؛ مگر مچھر بدستور موجود ہیں۔ وہ اُسی جوش و خروش کے ساتھ یورپ کی دلدلی زمینوں پر حکمراں ہیں۔ اُنکی نسلیں بیشمار ہیں۔ اُنکی فوجیں نہایت آزادی سے جھیلوں کے کناروں اور دریاؤں کے دہانوں پر سندناتی پھرتی ہیں۔

یہی مچھر ہیں، جو وبائی بخار اور دوسرے بخاروں کے جراثیم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتے ہیں اور اُنکو ایک جسم سے دوسرے جسم میں داخل کرتے ہیں کیسی حیرت انگیز بات ہے کہ انسان اُن تمام خوفناک درندوں پر غالب آگیا۔ جو کسی زمانے میں روئے زمین کے بہت بڑے حصے پر مسلط تھے۔ مگر وہ مچھر جیسی کمزور مخلوق کے مقابلے سے عاجز ہے۔

کیا یہ سچ ہے کہ عقل انسانی اکثر بڑی بڑی پیچیدہ مشکلوں کو حل کر ڈالتی ہے، مگر بعض چھوٹی چھوٹی مشکلوں کو حل کرنے سے عاجز رہتی ہے؟

ایک زمانہ ضرور ایسا آئے گا کہ ہم مچھروں، بھڑوں، مکھیوں اور تمام چھوٹے چھوٹے موذی جانوروں کو ہلاک کر ڈالیں گے اور اُنکی نسلوں کو روئے زمین سے ملیامیٹ کر دینگے، پھر اُن موذی جانوروں کے قتل کرنے کے بعد، جو آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں، ہم اُن ظالم جانوروں کے ہلاک کرنے کے درپے ہونگے، جو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتے؛ مگر انسان کو سب سے زیادہ تکلیف اُنھیں سے پہنچتی ہے۔

بڑے بڑے خوفناک درندوں کو ہلاک کرنے کی کوشش ہماری پہلی جنگ تھی۔ اب دوسری جنگ اُن چھوٹے چھوٹے موذی جانوروں سے ہے

ہونے والی ہے، جو آنکھوں سے نظر آتے ہیں۔ پھر تیسری جنگ اُن خوردبینی جانوروں سے ہوگی، جو چپ چاپ ہمارے خون میں تیر جاتے ہیں اور ہماری زندگی کو غارت کر ڈالتے ہیں، یہ دو جنگیں بہت سخت ہونگی اور انکے لئے زمانہ دراز درکار ہوگا، مگر کامیابی بنی آدم کے لئے یقینی ہے۔

اسکے بعد ذرا اُن جنگوں کا تصور کرو جو ہم کو بڑے بڑے جرائم سے کرنی پڑتی ہیں۔ اخلاق کے لحاظ سے ہم ابھی تک وحشیانہ حالت میں ہیں۔ قتل اور زنا اور چوری اور ڈاکہ زنی ایسے جرایم ہیں جن کا ارتکاب برابر ہوتا رہتا ہے۔ ہم ان خوفناک جرائم سے اسی طرح جنگ کر رہے ہیں، جس طرح قدیم زمانے کے انسان مہیتھ وغیرہ جو خوفناک درندے تھے درندوں سے جنگ کرتے تھے۔ عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ یہ بڑے بڑے انسانی جرائم معدوم ہو جائینگے۔ نہ لوگ ایک دوسرے کو قتل کرینگے۔ نہ عورتوں کی عفت وعصمت پر حملہ کیا جائے گا۔ نہ گھروں میں چوری ہوا کرے گی۔ نہ رہزنی اور ڈاکے کے ہولناک منظر دکھائی دینگے۔ اُس وقت کا انتظام تمدن اکمل ہو اسلئے نہ چوری اور ڈاکے کی ضرورت پیش آئے گی نہ قتل و غارت کی۔

مگر اسکے بعد ہی فوراً ہم اُن برائیوں سے جنگ کرنے پر کمربستہ ہونگے، جو ظاہر میں نہایت حقیر اور چھوٹی نظر آتی ہیں، تاہم اُن سے خطرے بہت ہیں، مثلاً ریاکاری، غرور، حسد، تعصب وغیرہ۔

یہ اخلاقی جنگ پہلی اخلاقی جنگ سے بہت زیادہ سخت اور طویل ہوگی، مگر اُمید کامل ہے کہ جس طرح ہم چھوٹے چھوٹے موذی جانوروں پر ایک دن غالب آئیں گے، اسی طرح ان چھوٹی خطرناک برائیوں پر بھی ضرور فتحیاب ہونگے۔

وحید الدین سلیم

لنڈن میں پرندوں کی نمائش

اس نمایش میں چار سو اکیس فی ات سے مرغ یا مرغیاں تھیں اور کل مرغ یا مرغیاں ملا کر ۴۴۰۰ تھیں۔ سب سے زیادہ قیمتی مرغ یا مرغی اس میں دو ہزار پونڈ یعنی تیس ہزار روپے کی تھی اس سے کم قیمت کی تو سینکڑوں تھیں۔ مگر دو پونڈ یعنی تیس روپیہ سے کم کوئی چڑیا نہیں تھی۔

ہمارے غریب ملک کے رہنے والے تیس ہزار روپیہ ایک مرغ کی قیمت سنکر بہت تعجب کرینگے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ایک مہربان نے ایک بٹیر کو لکھنؤ میں مبلغ ننٹ روپیہ کو بیچا تھا تو لوگ بیچنے والے پر ہنستے تھے کہ آخر اس بٹیر میں کیا صفت ہے جو اتنے روپے دیئے جائینگے۔ کیا یہ سونا موتی اگلیگا۔ مگر یہ سب دولت کے کمال اور ہر جنس کی قدر افزائی کے شوق کے کرشمے ہیں کہ یہ مرغ اور مرغیاں نہ تو موتی اگلتی ہیں اور نہ سونے کا انڈا دیتی ہیں (جیسا بچپن میں کہانیوں میں سنا کرتے تھے) لیکن ان میں ایسی صنعتیں ہیں جن سے اتنی قیمت مانگی جاتی ہے اور شوقین لوگ دیتے ہیں۔ اس نمائش کے چند مرغوں کی حالت لکھتا ہوں۔

نمبر ۴۶۶ نر ایک اور دو برس کے اندر۔ چت کبرا سپید چتیاں زیادہ ڈیڑھ گز لمبا ہے (سر سے لیکر پنجوں تک) وزن ۷ سیر۔ قیمت ۲۰۰۰ پونڈ۔

نمبر ۴۷۸ مادہ ایک اور دو برس کے اندر۔ چت کبرا سپید چتیاں زیادہ ہیں۔ وزن ۳ سیر۔ قیمت ۲۰۰۰ پونڈ۔

نمبر ۵۰۲ مادہ۔ سرخی مایل۔ وزن ساڑھے پانچ سیر (ایک برس سے بڑا) قیمت ۲۵۰ پونڈ۔ میرے سامنے ایک لیڈی سو پونڈ دیتی تھی۔ مگر مالک نے نہیں بیچا۔

نمبر ۵۷۹ نر سپید بے داغ (جیسا کہ اکثر پیرزادے نذر وغیرہ کے لیے

تلاش کیا کرتے تھے، قد اور وزن معمولی۔ قیمت ۲۰۰ پونڈ۔

جزائر سماٹرا کے بھی مرغ موجود تھے۔ جن کی سب سے زیادہ قیمت ۱۰۰ پونڈ تھی جاپان کی مرغیاں بھی تھیں۔ اُن میں ایک خاص صنعت یہ تھی کہ دُم کے پر سمیٹ لیتی تھیں۔ قیمت ۵ پونڈ ۵ شلنگ تھی۔

ہمارے ہندوستان کے بھی مرغ تھے۔ جنکی سب سے زیادہ قیمت ۱۰۰ پونڈ تھی دہم کو اس بات سے یہ سبق ملتا ہے کہ وُہی چیزیں جنکی ہم اپنے ہاں قدر نہیں کرتے ہیں۔ اُنکو لوگ یہاں لاکر تھوڑی سی محنت اور توجہ کے ذریعہ سے قدر کے قابل بنا لیتے ہیں،

ملایا کے مرغوں کی قیمت سب سے زیادہ ۲۰۰۰ پونڈ تھی، اور وزن میں سب سے زیادہ بھاری مرغ نمایش بھر میں وہیں کا تھا جسکی تفصیل وزن ونرخ وغیرہ ذیل میں درج ہے۔

نمبر ۳۲۱۳ نر مرغ۔ دو گز لمبا۔ وزن ۷ سیر قیمت ۲۰۰۰ پونڈ۔

ہسپانیہ کے مرغ کی سب سے زیادہ قیمت پچاس پونڈ تھی۔

بط سب سے زیادہ قیمتی ہندوستان کی تھی۔ جسکی قیمت ایک سو پونڈ تھی اور جو سفید بیداغ تھی۔ معمولی قد۔ کوئی اور صفت بظاہر اس میں نہیں معلوم ہوتی تھی۔ علاوہ ان کے اور عجیب عجیب مرغ اور مرغیاں تھیں۔ گو اُن کی قیمت کچھ ایسی زیادہ اِن قیمتوں کے مقابلے میں نہیں تھی یعنی سو پونڈ سے لیکر پانچ یا چھ پونڈ تک تھیں۔ سفید مُرغی کی ایک قسم تھی جس کے سر پر گوشت کا لبس، مگر وُہ لبس بالکل پگڑی کی طرح کا بنا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے طول کی پگڑی باندھ دی ہے ایک چھوٹی مرغی تھی۔ وزن بھی آدھ سیر کے اندر۔ بالکل تیتر کا رنگ تیتر ہی معلوم ہوتی تھی چند مُرغ اور مرغیوں کی حلق پھولے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گھینگا نکل آیا ہے۔

اب کبوتروں کا حال سُنیں۔

سب سے قیمتی کبوتر نمائش میں ۵۰۰ پونڈ کا تھا۔
نمائش میں کل ۱۵۵ ذات کے کبوتر تھے ہمارے ہندوستان میں اس سے زیادہ قسام کے کبوتر نکلینگے۔ اور ہر ایک اپنی اپنی قسم میں یکتا ہوگا تعداد میں ۷۳ اہم کبوتر تھے۔
نمبر۳۔ ایک سال کا پٹھا ۳۰ انچ لمبا۔ پاموز۔ دوباز۔ آگے کا پوٹا پھولا ہوا ذات کا لقا نہیں ہے یعنی وہ خود نہیں تنتا ہے۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کبوتر کے گھینگا نکل آتا ہو پوٹا اس قدر پھولا ہوا ہے کہ آگے سے منہ نہیں دکھائی دیتا ہے۔
قیمت ۵۰۰ پونڈ اس قسم کے کبوتر ہندوستان میں نہیں دیکھے۔
نمبر۲۰۔ صندلی نر سنہ ۱۹۰۴ء کا پٹھا۔ پوٹا اتنا بڑا ہے کہ آگے سے سر نہیں دکھائی دیتا۔ اس کا پوٹا سب سے زیادہ پھولا ہوا ہے۔ قیمت ۱۰۰ پونڈ
نمبر۱۹۰۔ سپید بے داغ لقا۔ اس قدر تنتا ہے کہ اس کے سینے پر منہ گھڑ اور نہ گرے (جو کہ خاص لقا کی صفت ہے) حالانکہ پر نہیں کٹے ہیں۔ ورنہ شاید بعض وقت الٹ جاتا قیمت ۱۰۰ پونڈ۔
نمبر۲۱۲۔ مادہ سپید بے داغ لقا۔ بجائے اس کے کہ یہ کبوتری تنتی ہو اسکی دُم بہت اٹھی ہوئی ہے۔ بالکل چھتری کی طرح سے سر پر پھیلی رہتی ہے۔
قیمت ۱۰۰ پونڈ۔ اس کے علاوہ دوسرے رنگوں کے کبوتر موجود تھے۔ مثلاً ہرے زاغ۔ کھیارے۔ صندلی۔ کاسنی۔ مکھی۔ سیاہ دوباز۔ موتی چور۔ چوٹی دار وغیرہ
چوٹی دار کی سب سے زیادہ قیمت ۱۰۰ پونڈ تھی۔
نمبر۲۴۴۔ کھیارا کیسی آنکھوں پر۔ خوردنکا۔ چونچ بالکل معلوم ہی نہیں ہوتی ہے۔ چونچ پر کھال کا بہت بڑا گچھا ہے۔ قیمت ۲۵۰ پونڈ۔
نمبر۵۰۰۔ سپید بے داغ۔ موتی چور۔ قیمت ۱۰۰ پونڈ۔
ایک ذات کی کبوتری لقا بھی تھی جسکو یہاں الو کہتے ہیں۔ وہ خوردنکی ہوتی ہے۔

آنکھ کے پپوٹے بہت بھاری ہوتے ہیں۔ مشورت میں اُن سے بہت مشابہ ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ قیمتی ۱۰۰ پونڈ۔

جرمن کے بھی کچھ کبوتر نمائش میں تھے۔ مگر افسوس ہمارے ہندوستان کے کبوتر نہیں تھے۔ حالانکہ ہندوستان میں اس وقت بھی بہت نایاب کبوتر پائے جاتے ہیں۔ ایک خاص فرات جسکو میں یہاں نہیں پاتا ہوں۔ نہ کہیں نمائش میں دکھائی پڑی۔ ہمارے ہندوستان میں بکثرت ہے۔ وہ لوٹن کبوتر ہیں جنکی میں خیال کرتا ہوں کہ یہاں بہت قدر ہوتی۔ کیونکہ ہمارے ہاں کے اُڑان کے کبوتر اور گرہ باز کی تو یہاں قدر ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر لوٹن تو ایسی چیز ہے جو ہمیں کے واسطے پیدا کیا تھا۔ جو لوگ کبوتروں کا تماشہ آسمان پر دیکھنے سے محروم ہیں وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر تماشا دیکھیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان کے اچھے لوٹن کبوتر یہاں بھیجے جائیں تو شاید اُن کی قیمت ۵۰ پونڈ سے زیادہ ملے۔ اور پھر قلمی لوٹن کی اور بھی زیادہ قدر ہو۔

گو یہ نمائش پرندوں کے لئے تھی۔ تاہم ایک گوشے میں کچھ چوہے اور خرگوش بھی دکھا دیئے گئے تھے۔ ہر رنگ کے چوہے موجود تھے۔ سفید۔ سیاہ صندلی۔ کاسنی۔ خاکی۔ اور ہر قد کے چھوٹے بڑے۔ منجھولے۔ اس میں خرگوش بھی ہر ذات کے موجود تھے۔ ایک قسم خرگوش کی تھی جس کے چار کان تھے۔

یہ گراں قیمتیں جو ان مختلف جانوروں کی لگائی گئیں۔ یہ محض چڑیوں کی نہیں تھیں بلکہ انکے رکھنے والے اپنی محنت اور نگہداشت کی قیمت بھی لیتے ہیں۔ ان لوگوں سے دریافت کیجئے تو ہر چڑیا کا نسب نامہ اُنکے پاس لکھا ہوا ہے کہ کس طرح سے اُن کی ماں اور باپ کی حفاظت کی گئی ہے۔ وہ یہ بھی بتلا سکتے ہیں کہ اُن کو کیا کھانا دیا جاتا ہے۔ ان چیزوں کو اس ملک کے تمول کے ساتھ مد نظر رکھکر قیمتوں کی یہ گرانی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ ان ذریعوں سے یہ لوگ ہر جنس کی عمدہ نسل بڑھانے کی تدابیر کرتے رہتے ہیں۔ اور تجربہ کرتے ہیں کہ کون سی جنس کس درجے کی ترقی کی قابلیت رکھتی ہے۔

رضی الدین احمد (لندن)

ساحل جمن اور ہندو مذہب کی شعریت

یہ مضمون حقیقت میں ایک خط ہے جو مسٹر عبدالروف نے اپنے ایک دوست کو کنارِ جمن کی سیر کے بعد لکھا تھا ہم خوش ہیں کہ وہ ناظرینِ تمدن کے لئے باعث دلچسپی ہوگا اس سے زیادہ خوشی مجکو اس بات کی ہے کہ مسٹر موصوف دو جذبات حسن و عشق کی ہمیشہ تحقیر کیا کرتے تھے" وہی ایک دن ہم میں سرشار ہو گئے اور انکی پارسائی پر قیامت آگئی دیکھئے آئندہ زمانہ ان کو کہاں لے جاتا ہے۔ شاعر اور رند شاہد باز۔

اوّل تو صبح کا سہانا وقت اور اسکی ٹھنڈی ہوا میں یوں ہی سیکڑوں رنگینیاں اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہیں جس کے لئے مزید دلفریبیوں کی ضرورت نہیں، ایک سلیم المذاق وجود کی سرشاریت اور کیف پروری کے لئے یہی کافی ہے کہ اسکو صبح دریا کے کسی ساحل پر ہو لیکن اس صبح کا کیا پوچھنا جبکو حسن نسوانی دلگہائے پرستش کی نگہت باریاں معطر کر رہی ہوں۔

یہ رسم کہ صبح اٹھکے حسن کی دیویاں اپنے ہاتھوں میں سامانِ پرستش لئے دریا کنارے جاتی ہیں خوب ہے، وہ جب پانی کے کنارے پہونچتی ہیں اور پانی انکے انتظار میں بیچین ہوتا ہے، اس میں کچھ پھول، نہیں پھول کی کچھ پنکھڑیاں ڈالتی ہیں۔ ایک عجیب پرکیف عالم ہوتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ساری فطرت اسکی پذیرائی کے لئے مستعد و آمادہ ہے، پانی کی ایک ایک لہر بلکہ اسکا ایک ایک قطرہ فرطِ انبساط سے ایک لطف

اضطراب و بیچینی کے ساتھ اُن پنکھڑیوں کو لئے پھرتا ہے اور پھر ہمارے سپرد کر دیتا ہے۔ ہم نہ معلوم اسکو کیا سمجھکر اٹھا لیتے ہیں۔

افسوس ریاض تم نہ ہوئے، جمعہ کا دن تہا صبح کو ہم لوگ گھاٹ کی سیر کو، یا یوں سمجھئے کہ اپنی ہلاکت کی سامان اندوزی کے لئے روانہ ہوئے واللہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ حسن آج نہانے کی رسم ادا کرنے جا رہا ہے دیکھئے انسان کو جس چیز سے نفرت ہوتی ہے اکثر قدرت اُسکو اُسی چیز کے ذریعہ سے شکست دیکر اپنی اہمیت و پسندیدگی کا اعتراف کرالیتی ہے، مجھکو مارواڑی عورتوں سے نفرت کلی ہے میں سمجھتا تہا کہ اس قوم کی طبقہ اناث کو جنس لطیف میں شامل کرنا حقیقتاً جنس لطیف کی ایک افسوسناک بیحرمتی ہے۔ لیکن ہائے مجھے کیا معلوم تھا کہ حسن کسی قوم کا ورثہ نہیں اسکی لطف فرمائیاں عام ہیں جس طرح وہ عمران و تہذیب پر لطف فرما ہے اسیطرح غیر متمدن اقوام میں بھی اسکا نشیمن ہے اگر وہ اعلیٰ معاشرت ملکوں اور قوموں پر جلوہ فگن ہے تو بھدے گھونگھٹ کی اوٹ سے بھی برق پاشیاں کرسکتا ہے، میں اس سے بے خبر تھا کہ گردن کی جنبش اور اسکے ساتھ آنکھوں کا اشارہ انسان کو پامال کرنے کے لئے کافی سے زیادہ ہے، مجھے علم نہ تہا کہ حسن ہر لباس و وضع میں اپنی شوخ اداؤں سے مسخر کرسکتا ہے، سولہ سترہ برس کی ایک نازک اندام مگر نیچپن سستی فرض کیجئے اور یوں تصور قایم کیجئے کہ وہ مصروف خرام ہے جمنا کے کنارہ سے پرستش کرکے واپس آرہی ہے، جسم کو کسی صورت قرار نہیں، اسکو یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ میرے ساتھ ساتھ مگر مودب فاصلہ پر میرے گرفتار کئے ہوئے لوگ کچھ اور بھی ہیں، وہ ایک دفعہ اپنے

گھونگھٹ کو ایک طرف کر لیتی ہے کہ برق پاشی کے لئے کوئی حجاب باقی نہ رہے، اور اپنی نازک گردن ایکطرف جھکا کر گوشۂ چشم سے ایک اور صرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالتی ہے، صبر و قرار ہاتھ سے جاتا رہتا ہے دیکھنے والا مسحور و بیخود ہو جاتا ہے، اعضا میں پُر لطف تمکن دماغ میں ضعف اور اپنی رفتار میں مخموریت محسوس کرنے لگتا ہے۔ تھوڑا آگے چلنے کے بعد وہ پھر اُسی انداز سے دیکھ لیتی ہے غریب انسان بالکل بے بس ہو جاتا ہے۔

غرض یہ کہ پھر نہ معلوم تمام دن ہمپر کیا گذری اور کس پر کیفیت بیکیفی میں جمعہ کی نماز پڑھی اور کہاں پڑھی سارا دن ایک عجیب مخموریت و سرشاریت میں گذر گئی۔

دوسرا دن عید کا تھا اوّل تو مُسافر کی عید ہی کیا، پھر مُسافر بھی کیسا۔ غرضکہ کیسا نہانا کیسا دھونا آفتاب ہمکو دریا کے کنارہ اُنھیں حُسن کی دیویوں کے انتظار میں ملا۔ آہ یہ صبح تو نہ معلوم اپنے ساتھ کیسا سامانِ جراحت لائی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ سوز بیوگی عورت میں جو شان پیدا کر دیتا ہے وُہ بات دوشیزگی میں نہیں، اِس میں ایک قسم کی دیویت پیدا ہو جاتی ہے اور اُس میں یہ بات نہیں، ایک عجیب اُداسی ہوتی ہے۔ قیامت ہے وُہ عالم کہ عورت ابھی حال ہی میں اپنے مایۂ نشاط محرم راز سے تمام عمر کے لئے جُدا کر دیگئی ہو اسکا وہ مغموم مگر شگفتہ چہرہ نہ معلوم کیا غضب ڈھاتا ہے۔ آہ اسکو جب کبھی اپنا عیش جو اس سے ہمیشہ کے لئے چھن گیا ہے یاد آجاتا ہے تو وُہ صرف دانت سے اپنا نیچے کا نازک ہونٹ دبا لیتی ہے اور ایک پُرسوز نیاز کے ساتھ اپنے ہاتھ کی کلیاں لیکر مندر پر چڑھاتی

ہے لیکن حقیقتاً وہ ان کلیوں کو کہاں پہنچ سکی ہے، ہلکی گلابی ساری زیب
تن کیئے ہوئے، سُرخ مخمل کی نیم آستین، اسپر سُرخ کناری لگی ہوئی اسکی
لمبی اور نازک اُنگلیاں باہر نکلی ہوئیں اور سامان پرستش میں ہاتھ۔ ایک
عجیب کیفیت تھی جس سے حسن کا تقدس برستا تھا۔ افسانا میں نہیں
سمجھتا کہ کس چیز سے اسکو تشبیہ دوں۔ بس یہ سمجھئے کہ حسن و شعر، رنگ و
بُو اور موسیقی سے ترکیب پا کر اگر کوئی وجود ہو سکتا ہے تو وہ اُسی شیام رنگ
بیوہ کا تہا وہ ایک پھول تھی معطر، ایک حسن تھی معصوم، ایک شعر تھی
پر کیف، جس سے وہ ایک عالم کو مخمور و بیخود بنا سکتی تھی +

رؤف

اِس درمیان میں ہمارے پاس اکثر کتب و رسائل بغرض ریویو آئے
ہیں مگر افسوس ہم اب تک انپر کوئی تنقیدی نگاہ نہیں ڈال سکے لیکن آج ہم
اس رسالہ کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔

القمر یہ ایک ماہوار صحیفہ ہے جو دہلی سے مولوی عبدالعزیز صاحب کے
زیر ادارہ شائع ہوتا ہے اسوقت تک اس کے تین نمبر ہماری نظر سے
گذرے ہیں، اوّل سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا پرچہ نمایاں امتیاز
کے ساتھ نکلا ہے جس سے معلوم ہوا کہ القمر ارتقائے تدریجی کے ماتحت روز
افزوں ترقی کر رہا ہے اور اُمید ہے کہ وہ ایک دن بدر کامل ہو کر افق دہلی
سے نکل کر اپنی ضیا بخشی سے سارے ہندوستان کو منور کر دے گا۔
حسن طباعت عمدگی کاغذ وغیرہ سے دیدہ زیبی کی پوری کوشش کی
جاتی ہے مضامین کی ترتیب و تہذیب میں بھی سلیقہ شعاری سے
کام لیا جاتا ہے اُمید ہے کہ مولانا آیندہ چلکر اس میں بھی اچھی طرح سے
کامیاب ہونگے تنوع مضامین کے لحاظ سے اسکو عطر فتنہ کہنا چاہیئے

چند دن بمبئی میں

چند دن بمبئی نقاد کے دو نمبروں میں شائع ہو چکا ہے اس کی تیسری قسط حضرت نیاز نے تمدن کے لئے عنایت فرمائی چونکہ سلسلہ کے لئے نقاد کا حوالہ دینا ناظرین کرام کے لئے ایک قسم کی تکلیف ہوتی اسلئے ہم اسکو بھی نقاد سے نقل کرتے ہیں، جہاں سے نئی قسط شروع ہوگی ایک امتیازی خط کے ذریعہ اس جگہ کو نمایاں کر دینگے۔ قارئین کرام کو کم خوشی نہ ہوگی کہ حضرت مولانا نیاز کی توجہ پھر تمدن پر مبذول ہوئی ہے جو اس کے دیرینہ عنایت فرما ہیں۔

۲۰ مئی کی شام بھی کیسی مہک شام تھی، جب میں نے بمبئی کے لئے اپنا اسباب سفر درست کرنا شروع کیا! میرا اسباب ہی کیا تھا کہ میں درست کرتا لیکن کسی محبوب مقام کی تیاریاں کرنا گویا تنہائی میں اُسکا ذکر کرنا ہے، اور میں چاہتا تھا کہ اس ذکر کی تکرار ہو، بستر لپیٹ رہا ہوں۔ اور ٹکٹ بھی لے رہا ہوں لیکن ہوں، اپنے ساتھ لیجانے کے لئے چیزیں چُن رہا ہوں، اور پلیٹ فارم پر ٹہل بھی رہا ہوں، ہوں ہانسی میں لیکن پھر رہا ہوں بمبئی میں، وقت واحد میں اختر منزل کے بالاخانے پر بھی ہوں اور ساحل اپالو پر بھی ———

اُف رے تخئیل تیری لطف پاشیاں!

"بہ حد شوق نفوذ تخئیل" ہمارا روز کا تجربہ ہے، لیکن ہماری یہ اشراقیت کہ کہیں کا نام سُنا اور فوراً اُسکے حدود پیش نظر ہو گئے، وہاں کی سڑکیں، وہاں کی گلیاں، وہاں کے مقامات تفریح کی کیفیتیں، وہاں کے لوگوں کی صورتیں سامنے کھنچکر رہ گئیں۔ بسا اوقات زیادہ پُر لطف ثابت ہوتی ہے

اور جب اُس جگہ ہم پہونچ جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تخئیل کی وارفتگی خیال کی ربودگی کیسی پاکیزہ چیز تھی کہ بیچ "حضور گلشن بے اختیاری کردہ نگینم" اور ہمارا العجائبکدۂ دماغ جو "تخئیل" کی بت سازیوں کا کرشمہ تھا بہت زیادہ پرکیف مناظر سے معمور تھا۔ لکھنؤ، آگرہ، دلّی وغیرہ جانے سے قبل وہاں کا ذہنی جغرافیہ، وہاں کے مرقعے اپنے پاس ستھے اور راتوں کی خلوت میں بارہا ہم وہاں کی گلیاں چھان چکے ستھے۔ لیکن جب وہاں پہنچ گئے تو کیا ہوا! وہ جغرافیہ جس میں زمین کے بہترین مناظر کا حال درج تھا فراموش ہو گیا، وہ مرقعے جن کی ترکیب بہترین صور سے ہوئی تھی اور وہ ذراتِ حسن جو وہاں کی گلیوں میں نظر آتے تھے یکسر محو ہو گئے۔ افسوس ہوا کہ ناحق زحمتِ سفر اختیار کی۔ پردۂ شب پر، اپنے تخئیل کی مصوّری ہی اس سے اچھی تھی لیکن صرف بمبئی ایک ایسا مقام نکلا جسکو دیکھکر میں ایسا محسوس کرنے لگا گویا میرے تمام اگلے پچھلے قیاسات و تصوّرات نے جسم اختیار کر لیا ہے اور اسکا نام بمبئی (Bombay) رکھدیا گیا ہے۔

ایک عرصہ سے وہاں جانے کی آرزو قلب میں پرورش پا رہی تھی، لیکن اُس کے شباب کی رنگینیوں کا کچھ ٹھکانا نہ تھا جب میں نے مصمّم ارادہ کر کے اُسے اپنے سارے خون میں دوڑا دیا۔

ٹھیک گیارہ بجے شب کو میں ہانسی سے سوار ہوا اور صبح کو دلّی پہنچکر شام کو ۵ بجے آگرہ اُتر پڑا، مہمان دلگیر ہوا خیال تھا کہ ایکدن یہاں ہو نگا لیکن گرمی کی شدت نے اجازت نہ دی اور مجبوراً ۶-۷ گھنٹوں کے بعد ہی میں نے رات کی گاڑی سے آخرکار اپنا وہ سفر شروع کر دیا جو اسوقت میرے تمام اعضاء پر حکمراں تھا۔

بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

ریل میں بیٹھئے اور سفر طویل ہو، تو سب سے پہلے لطف معیت کی جستجو ہوتی ہے یعنی اگر تنہائی نصیب نہو، جو بہترین ندیم ہے، تو خیر وہاں کی ..... بیٹھنے والی صورتیں تو ایسی ہوں جنکو دیکھکر بینائی مجروح نہو، مگر یہ پہلا شگون نیک تھا کہ میرے ساتھ کوئی نہ تھا اور اس لئے جلدی جلدی بستر کھولا اور کھڑکی میں سر ڈالکے اُن نقوش پر نظر ثانی کرنے لگا جو اُسوقت میرے دماغ کے تنہا مالک تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنی دیر میں اس لذت میں مستغرق رہا، کیونکہ جب میری آنکھ کھلی، تو ۲۲ مئی کا سورج بہت بلند ہو چکا تھا۔ اور ایک جوان فرنگن مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی، یعنی مجھے ملامت کر رہی تھی کہ میں کیوں گھنٹوں قبل رات کو اس گاڑی میں بیٹھ گیا جس میں صبح کو اُسے سوار ہونا تھا لیکن باوصف اس تحقیر و تذلیل کے میں خوش تھا۔ میں کیا کرتا اگر وہ گھورنے والی آنکھیں کسی فرنگی کی ہوتیں اور وہ نکر پہنے ہوئے اپنے کھلے ہوئے چوڑے چکلے گھٹنے پر ہاکی کھیلنے کے ڈنڈے سے سگرٹ جلانے کے لئے دیا سلائی رگڑتا ہوتا۔ میں اُٹھا اور میں نے اوس برہم ملکہ سے معذرت کی کہ "اگر اس وقت تک میرے لیٹے رہنے سے کوئی تکلیف پہنچی ہے تو میں بہت نادم اور یہ سمجھئے اٹھا جاتا ہوں،" خدا معلوم میرے انداز بیان میں کونسی ایسی بات تھی جو اوسے بھلی معلوم ہوئی بہرحال وہ مسکرا پڑی اور اپنی دو نہیں نہیں سے اُسنے مجھے یقین دلادیا کہ وہ اگلے اسٹیشن پر پہنچکر وہاں کے اسٹیشن ماسٹر سے سرگوشیاں کرکے مجھے یہاں سے نکلوا دینے کی کوشش نہ کریگی۔ آگے چلکر دو چار مہذب وضع حضرات اور بھی

اُگر بیٹھ گئے اور میں خوش ہوا کہ اگر نکالا بھی جاؤں گا تو میرے کرتے کا گریبان اُنکی قیصموں کے کالر سے پیچھے ہی رہیگا۔ مگر خیر یہ مصیبت جسکا بارہا مجکو تجربہ ہو چکا ہے اور جو حقیقتاً ہمارے سلئے "تازیانۂ عبرت" ہے، پیش نہیں آئی اور وُہ کسی اسٹیشن پر ۹-۱۰ بجے کے درمیان اُتر پڑی۔

میں سفر میں اِس بات سے بہت گھبراتا ہوں کہ کوئی مجھسے اسقدر بے تکلف ہو جائے کہ لامحالہ مجھے اسکے ہر سوال کا جواب دینا پڑے خیر، یہاں تک تو کوئی ایسا حرج نہیں کہ "کہاں جائیگا"، لیکن اسکے بعد میں "کیوں"، نہیں سُن سکتا اور خاصکر پھر ایسے سفر میں جس کے متعلق اگر میں خود اپنے سے سوال کروں کہ "کیُوں جا رہا ہُوں"، تو کوئی جواب مجھے نہ ملے۔ چنانچہ ایک صاحب نے میری طرف سوال کرنیکو اپنا چہرہ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے کتاب اُٹھائی اور دیکھنا شروع کیا اور میں کھلی ہُوئی اخلاق شکنی سے بچ گیا۔

کسی دور دراز کے مشہور مقام پر جانے والے مُسافر سے سَوال کیجئے تو وہ نہایت نخوت سے مختصر سا جواب دیتا ہے کہ "کیلاکتا" "یا" بمبئے" یعنی جس طرح ریل پر سوار ہونے والا پیدل چلنے والونکو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے تئیں بہت بالا و برتر سمجھتا ہے، اسیطرح ایک ہی گاڑی میں سفر کرنیوالے اظہار تفوق کا یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں اور پھر تماشہ یہ کہ جہاں کسی نے "کلکتہ"، "بمبئی"، یا کسی دوسرے دولتمند شہر کا نام لے دیا تو قریب کے جانیوالے غریب کچھ ایسے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ خواہ مخواہ وہ اُس کے اندر شان امارت محسوس کرنے لگتے ہیں اور اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں سے یہ ظاہر کرنے لگتے ہیں کہ یہ شخص کیسا خوش قسمت و قابل رشک ہے!..

جو بہت سے اگر کسی نے پوچھا بھی تو ہر آگے آنیوالے اسٹیشن کا نام لیکر کہدیا کہ اسطرف جاتا ہوں۔ میں سچ یہ پسند نہیں کیا کہ میں "بمبئی" کہکر کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا کر دوں اور وہ خواہ مخواہ سمجھنے لگے کہ میں اظہار فوقیت کرتا ہوں ــــــ غرض دن بھر اسی لغویت میں گذرا کہ کون آتا ہے اور کون جا رہا ہے گرمی کا وہ عالم تھا کہ تالو پیاس سے چٹخا جا رہا تھا اور ریلوے کی انتظام کی یہ حالت تھی کہ ...... ہر اسٹیشن پر غریب مسافر پروانوں کی طرح "ڈول والے" پر گرتے تھے اور وہ سب کے سامنے ڈول کو اوندھا کرکے دکھا دیتا تھا کہ پانی نہیں ہے۔ شام ہوئی تو گرمی میں کچھ تخفیف ہوئی اور طبیعت کو کچھ سکون ہوا۔ اب صرف ۱۲ گھنٹوں کا فصل تھا کہ ریل مسافروں کو بمبئی لیجا کر ڈالدیتی اور اس لئے دو ثلث مسافت طے ہو گئی تھی۔ میں لیٹ گیا اور کوشش کرکے سو گیا۔

۲۳ جون کی صبح کو جو آنکھ کھلی تو سواد بمبئی شروع ہو گیا تھا اور سب سے پہلا منظر جو پیش نظر تھا کھجوروں کے درختوں کا تھا جو سبز و شاداب جھکروں اور پھیلے ہوئے قطعات آب سے ملکر آنکھوں میں سمائے جا رہے تھے۔ راستہ کے خشک و گرم میدانوں کے دیکھنے کے بعد اچانک یہ کونسا نظر خدا جانے کیسی نعمت تھا۔ میں اس منظر کی عزیزیت سے بہت متاثر ہوا اور ایسا محسوس کرنے لگا گویا دشتِ نجد میں قیس اتفاقاً کہیں لیلیٰ کو پا گیا ہے اور صحرا کی وحشت و خشکی جو شاید اسی ملاقات کی منتظر تھی اکبار کی رونق کو سبز سبزی خنکی اور تری میں تبدیل ہو گئی ہے۔ یا تو وہ ادھر ادھر لانبے لانبے سبز کھجوروں کے جھنڈ، وہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا زمردین سلسلہ، اور پھر اس پر حیات جاودان آب کی غیر متناہی شکنیں۔

ایک عرب خاتون، ایک مصری دوشیزہ کو ریل میں بٹھا کر اسطرف سے لیجاؤ، ممکن ہے وہ اپنے جذبات کو چہرہ سے ظاہر نہ ہونے دے ممکن ہے کہ وہ اپنے سانسوں کے نظام میں کوئی فرق نہ آنے دے لیکن اُسکی نازک کلائی پر ہاتھ رکھکر ضربات نبض کا شمار کرو تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ وہ یہاں عشق کرنا سیکھ سکتی ہے، وہ یہاں اپنے اعضا میں خواہش سپردگی محسوس کرسکتی ہے، المختصر یہ کہ راستہ کی ساری خستگی کچھ عجیب پُرلطف انبساط ہوگئی اور سادے شدا ید گرما محو ہوگئے کوئی آدہ گھنٹہ تک ریل انہیں قطعات حریہ میں ہوتی ہوئی گذری یہانتک کہ ساڑھے سات بجے آہستہ آہستہ ہوکر اُس سرزمین حسن وعشق، اُس بلدۂ شعر و موسیقی میں پہنچ گئی، جس کی تمنا میری ہستی کے اندر ایک الگ روح بنی ہوئی تہی، اور اس مقام کی وہی خصوصیت جس نے میرے دل کو تڑپا رکہا تہا آخرکار پیش نظر ہوگئی۔ پارسیوں کی حبش لطیف کا حسن گو میرے لئے اجنبی تہا لیکن یہ خیال کہ "بمبئی توان کا مسکن ہے" "یہاں توان کی حکومت ہے"، تصور کی ..... فراوانی سے تنگ آکر ہجوم حسن کا آرزومند تہا اور اس پرستش کا کس زبان سے شکریہ ادا کیا جائے کہ دادر اسٹیشن پر پہنچتے ہی اُس حسن کا ایک نہایت پاکیزہ و پُرشباب نمونہ، میری بیخودی و دارفتگی کا ترانۂ خیرمقدم گا رہا تہا میں اس کو اپنا ہی خیر مقدم سمجھوں گا کیونکہ وہ میری گاڑی کے ٹھہرتے ہی اُٹھی اور میں اس کا "وہ ترانہ ہی کہوں گا" کیونکہ اُترتے ہی میں نے اُس کی آواز قدم سُنی۔ آہ، کون جانتا ہے کہ حسن کی اگر کوئی زبان ہے تو صرف "موسیقی" ہے اور ایک حسین عورت کی جو حرکت ہے وہ ایک

نطق موسیقی ہے میں کا سازِ نغمۂ یت اور صرف "دلنشینیت" ہے وہ ہاتھ ملاتی ہے گویا ہوا میں نقش ترنم بنا دیتی ہے چلتی ہے اور اپنے پیروں سے زمین پر نشان موسیقی چھوڑ جاتی ہے۔

آہ اے موجدِ عشق و محبت، صرف تیری ضرورت ہے، اڈیسن کا دماغ یہاں بیکار ہے، گراموفون میں ساؤنڈ بکس کی سوئی جب کارڈ کو چھوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کارڈ نغمہ منجمد ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ آوازِ حسنِ کائنات کے ہر ہر ذرہ میں منقوش ہے، دل میں بجائے اس سوئی کے اک پھانس ہو اور پھر وہ اس ذرہ سے مس کرے، تو پتہ چلے کہ یہ تمثالِ نغمہ، یہ نقشِ بردارِ موسیقی اک محبت والے دل کا کس قدر محتاج ہے ——— اور اس لئے اے بمبئی میں تیرا ممنون ہوں کہ تو نے میرے خیر مقدم میں اپنے ہاں کے بہتر گیتوں میں سے اک گیت بھیجا۔

ضرورت تھی کہ اس وقت میں تنہا چھوڑ دیا جاتا اور بالکل آزاد، لیکن افسوس ہے کہ مجھے ابھی اور آگے جانا تھا اور یہاں گاڑی بدلنی تھی اسباب سنبھالنے میں مصروف ہوا، لیکن میں نے اپنے ایک دوست کو یہاں پہونچنے کی اطلاع اُسی وقت ایک کارڈ لکھ کر دیدی۔ کہ ع۔

اے رفیقاں نو بہار آمد کنوں دیوانہ ام

دادر بمبئی کا لوکل اسٹیشن ہے اور مجھے ماہم جانا تھا جو یہاں سے دو تین اسٹیشن اور آگے ہے خیر، اس دلنشین آفت، اس سکونِ جان قیامت کو جو پلیٹ فارم پر خراماں تھی "زندہ باد" کہتے ہوئے رخصت ہوئے اور آدھ گھنٹہ میں ماہم پہونچ گئے، جہاں مجسمۂ صدق و خلوص

پیکر محبت و صفائی، ہیکل حسن اخلاق مسٹر لطیف الدین احمد میری پذیرائی کے لئے موجود تھے۔

پانچ منٹ میں، ہم اُس جگہ پہونچ گئے جہاں قیام کرنا تھا، افسوس ہے کہ مسٹر لطیف کی مشغول و منہمک زندگی کو دیکھکر میں خوش نہ ہوا کیونکہ میری رائے میں حقیقتاً وہ اس کے لئے وضع نہیں ہوئے، لیکن ابھی اس تنقید کا موقع نہ تھا اور میں نے انکو اجازت دیدی کہ وہ جائیں اپنا کام کریں۔ اب مجھ سے اُنسے تین چار گھنٹہ کے بعد ملاقات ہوتا تھی۔ اسلئے میں بالکل تنہا رہ گیا اور لگا اطمینان سے بیٹھ کے یہ سوچنے کہ دو دن تو یہاں آکے بھی ویسا ہی زار و خراب رہا''

یہ مکان اُس سلسلہ آب کے کنارے ہے جو بمبئی کو جزیرہ نما بناتا ہے اور اس لیئے یُوں کہنا چاہئے کہ میں ساحل بحر پر تھا جہاں میری نگاہ کی پرواز کے لیئے ایک وسیع رقیق میدان موجود تھا۔ اس مکان کے چاروں طرف بھی کھجوروں کے درخت کثرت سے موجود تھے اور وہی معصومیتِ منظر یہاں بھی پائی جاتی تھی۔

شام کو ہم اور مسٹر لطیف ریل میں بیٹھ کے چرچ گیٹ اسٹیشن گئے اور وکٹوریا میں بیٹھ کے اُس کارگاہ حسن و جمال پر پہونچ گئے جو ساحل اپالو کے نام سے مشہور ہے +

ہاں، میں اُس کارگاہ جمال و لطافت، اُس نزہت آبادِ حسن و نزاکت میں پہنچ گیا جہاں سب سے اس سے بہت پہلے پہنچنا چاہیئے تھا۔

حسن عالم اس سے کہ وہ اک نوزائیدہ سبزہ کی نرم و نازک پتی اور

اک ہلکے رنگ کی کلی میں آسودہ ہو، یا وہ نوعِ انسان کی ایک خاص جنس میں
پانزدہ سالہ دوشیزگی کو اپنا نشیمن بنانا پسند کرے، فطرۃً اس امر کا مقتضی ہے
کہ حسن ہی اُس کا متلاشی ہوا جمال ہی اُس کی جستجو میں سرگرداں ہو جس طرح
نزاکت کا بار اُٹھانے کے لئے نزاکت ہی زیادہ موزوں ہے، بالکل
اسی طرح حسن کی معیت کے لئے حسن ہی پسندیدہ ہے۔ نازک ہیلوں پر
ایک تیتری کی بیٹھی ہوئی بھلی معلوم ہوتی ہے، اور ایک حسین و صبیح پیشانی پر
صندل ہی کا قشقہ کچھ لطف دیتا ہے۔

معدنی اشیاء میں سونے اور پارے کے خصوصیات مجھے بہت
پسند ہیں۔ وُہ جاذب ہے اور یہ منجذب، وہ پسندیدۂ حسن ہے اور یہ
حسن پسند۔ عورت سونے ہی کے زیور پر جان دیتی ہے اور سُنا ہے
کہ پارہ بھی اپنے معدن سے باہر نہیں آتا جب تک کوئی حسین لڑکی
گردن جھکا کے جھانک نہیں لیتی۔

بچہ اپنے لطف کے لئے بچوں ہی کا ساتھ ڈھونڈھتا ہے، کوئی
بوڑھا اُن میں بیٹھ ہی جائے تو کیسا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ محفلِ رقص و سرود
میں مُغنیہ کی نگاہ وہیں پڑتی ہے جہاں نوجوانوں کا مجمع ہوتا ہے کوئی اُسی
کا ہمسن چھیڑ دے تو پھر دیکھئے کیسی مست ہو کر جواب دیتی ہے اور جہاں
کسی سن رسیدہ شخص نے کوئی بات کہی اور اُسکی طبیعت سرد ہوئی۔

حسن میں کشش ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر کھنچ جانیوالی چیز
مقبول بھی ہو سکتی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ حسن کا مطلوب معنوی کون ہے،
کیونکہ حقیقتاً مطلوبِ حسن ہونے کی اہلیت رکھنا ہی وہ حسن ہے جو
ہماری رائے میں حسنِ اول کی معیت کا مستحق ہے موسم برشگال میں

افق کی سیاہی کا سرسبز نشو و نما ہم بھی دیکھتے ہیں، چاروں طرف جوشِ سبزہ ہمیں بھی اچھا معلوم ہوتا ہے، باغوں کی فصیل پر طاؤس کا خرام ہمارے دل میں بھی گدگدی پیدا کرتا ہے، کوئل کی مستیاں ہمارے دماغ پر بھی چھا جاتی ہیں، لیکن ایک رند سے پوچھو وہ کہتا ہے کہ "میں چاہتا ہوں بادل کا ایک ٹکڑا نظر نہ آئے ہمیشہ خشک سالی کے مصائب رفع کرنے کی کوششیں کیجاتی ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ لوگ شراب پینا شروع کر دیں کہ کبھی امساکِ باراں کی شکایت ہی نہ ہو" غرضکہ وہ اودی اودی گھٹاؤں کو دیکھکر بیتاب ہو جاتا ہے اور جب ہم مکان کی چھتیں دیکھا کرتے ہیں اُسیوقت وہ باہر جنگل میں سبزہ پر بیٹھکر جھوما کرتا ہے قطعاً وہ اس حسنِ موسم کا مطلع بھی ہے اور وہی اُس سے لطف اُٹھانے کا اہل ہے، مظاہرِ قدرت کا محبوب اور حسنِ مناظر کے نزدیک حسین وہی ہے جو اپنے تئیں اُن میں محو کر سکے بلکہ اگر زبان ہوتی تو وہ کہدیتی کہ "مجھے تو صرف ایک بھونرا چاہیئے جو ہر وقت مجھے لپٹائے رہے، مجھے پروا نہیں اگر وہ میرا سارا رس نکال لیتا ہے، ہر چند اسکا شوق اُسکے لیئے مایۂ حیات ہے لیکن میں خوش ہوں اگر میری بربادی اُس کی زندگی ہے کیونکہ اعترافِ محبت کا یہی ایک پسندیدہ طریقہ ہے"

اسی لئے میں نے کہا کہ

یہاں میرا آنا بعد از وقت ہوا۔ دل میں ولولہ کی وہ فراوانی نہیں کہ حسنِ مناظر کے لئے جی کھول کے اپنا وقت صرف کر سکوں، عنفوانِ شباب کی وہ رعنائی نہیں، حالانکہ غریب مرد کے صحیفۂ حیات میں یہی ایک تنہا عنوان تہدیہ *Dedication* عورت کے مطالعہ کے قابل ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہاں آنے کا مجھے بہت شوق تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں کا پورا لطف اٹھانے کے لئے صرف اسقدر شوق کافی نہ تھا۔ حسن سے پوری طرح مستفید ہونیکے جذبات عرصہ ہوا کہ میں اپنی تمناؤں کے ساتھ سینہ میں دفن کر چکا ہوں اور اب ضرورت تھی کہ حیات بقیہ میں خاص تحریک پیدا کرنے کے لئے کسی محرک قابل کی شدید مواصلت نصیب ہوتی اور وہ کہاں؟ لیکن پھر بھی باوصف ان تمام نقصانات طبیعت کے مجھے تباہ اور برباد کر دینا یہاں بہت آسان تھا، لیکن شکر ہے کہ مسٹر لطیف کی عدیم الفرصتی میری حیات کی ضامن ہوگئی اور میں زندہ وطن واپس آیا۔

جس وقت میں ایپالو پہنچا، تو میں متحیر تھا کہ کیا فی الحقیقت میں کبھی ساحل بحر پر کھڑا ہوں؟ یقین نہ ہوتا تھا کہ میں خشکی کا اسقدر حصہ طے کر کے یہاں آگیا ہوں جہاں سے قدرت کی یہ رقیق اعجوبہ نمائیاں شروع ہو کر دنیا کے تین چوتھائی حصوں پر قابض ہوگئی ہیں۔ ایک ہموار نگاہوں کے لئے ناقابل عبور سطح امواج! یہ معلوم ہوتا تھا کہ فطرت کی وسعت تخئیل نے ایک صورت اختیار کر لی ہے۔

میں سمجھتا تھا کہ اونچی اونچی لہروں کے ہیبت ناک غیر منقطع سلسلہ اور ایک سامعہ شکن شور کا نام سمندر ہے، لیکن میں یہ دیکھکر کیسا متحیر ہوا کہ وہ تو صرف ایک سکون ہے متحرک، ایک خموشی ہے متلاطم! اسکے وہ نرم نرم آواز! یہ نہ پوچھو کر ساحل کے لذائذ سرد میں بھی کیسی ڈوبی جاتی تھی۔ اُف وہ موجوں کی پرغم روانی! ازرقت وعلاقت جاکے دیکھو اور سر دھنو۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں، اور بعض بعض تو بالکل وہی "دو ڈولتے پتے"

ایسی آزادی اور تیزی کیساتھہ سمندر کے سینہ پر دوڑتی پھرتی تھیں کہ قوتِ بحر کی طرف سے اعتقاد دیکھہ کر دور ہوتا نظر آتا تھا، لیکن جب ذرا فاصلہ پر ایک عظیم الشان جہاز سمندر کی ہر سانس کے ساتھہ متحرک نظر آیا، اور اس سے اور دور روشنی کا مینار (بحری جگنو) اپنے ضیا کے قبض و بسط سے نگاہوں کو اپنی طرف کھینچنے لگا، تو سخت حیرت ہوئی کہ خدایا یہ قرارِ سکون، یہ ذخارِ خموشی جو حقیقتاً پردہٴ تلاطم، نقاب طوفان ہے کیونکر انسان کو ایسا جری و بیباک بنا سکی۔

جسوقت ہم ساحل پر پہنچے شام ہو چکی تھی بجلی کی روشنی جو صرف لب آب جگمگانے کے لئے وضع ہوئی ہے اور وہ لب آب جسپر اپالو اور چوپاٹی بجا طور سے فخر و ناز کر سکتے ہیں، سمندر میں پڑی تھرا رہی تھی اور تاج محل ہوٹل جو ہند کا بہترین نزل ہے معہ اپنی تمام روشنیوں و دلاویزیوں اور ارتفاع و شوکت کے پانی کے اندر ہچکولے کھاتا نظر آرہا تھا۔ کشتیوں پر کہیں لوگ سوار ہو رہے تھے۔ کہیں اُن سے اُتر رہے وس جا رہی تھیں، تو بسیں واپس آ رہی تھیں۔ مختلف شکل و وضع کے لوگوں کا مجمع تھا، جن میں کوئی ٹہل رہا تھا، کوئی بیٹھا تھا۔ لیکن کیسی پُر لطف و تعجب انگیز بات تھی کہ اس مجمع میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس کو جادہٴ نظر دوسرے سے مختلف ہو، اِک طوفانِ نظارہ تھا جو سطح آب پر برپا تھا، اِک سیلاب شوق تھا جو سمندر کی سیّال خموشی کو محیط تھا۔

سُنا ہے کہ سمندر کی صبح و شام بہت پُر لطف ہوتی ہے، یعنی اگر صبح و شام کا اصلی حسن دیکھنا ہے تو آئینہٴ آب میں دیکھنا چاہئے، اور اگر

سمندر کے مناظر سے حقیقی مسرت حاصل کرتا ہے تو وہ وقت تلاش کرنا چاہیے جب آفتاب نہا کر نکل رہا ہو یا نہانے کے لیے اس کے اندر جا رہا ہو۔ چنانچہ نیچر نے اس کا انتظام یہاں اس طرح پر کیا ہے کہ وہ شاخ بحر جو ساحل اپالو بناتی نکل جاتی ہے آفتاب کے غسل و بادی کے لئے مخصوص کر دی ہے اور ساحل چوپاٹی کے آغوش میں اسکا شام کا نام بنا دیا گیا ہے اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ جس وقت میں ساحل اپالو پہ چل پھر رہا تھا، آفتاب چوپاٹی میں تھا۔ پھر میں بہار آیا کرتا تھا، ساری دنیا یہاں کیا کرتی تھی ؟ شاید آپ ماننے کے لئے تیار نہ ہوں لیکن سچ ہے کہ ... جس نے شام کو اپالو نہیں دیکھا یہ ماننے کے لئے تیار نہ ہو ... لیکن میں حقیقت سے انحراف کرونگا اگر اسکا اظہار نہ کروں کہ وہ شام جس کے مفہوم میں تاریکی کا تصور جزو اعظم ہے حقیقتاً یہاں آتی ہی نہیں، اور اگر آتی بھی ہو تو صرف اس لئے کہ بجلی کی روشنیوں، حسن کی صباحتوں، گوروں کے گورے مکھڑوں کے تبسموں، کھلی ہوئی بلوری گردنوں پر لٹکنے والے آویزوں کے جھوٹ اور اسی قسم کی بہت سی نامعلوم یاسمینی سپیدیوں میں اپنے تئیں تحلیل کر دے۔ پھر اگر دن کی روشنی میرے سامنے غایب ہوگئی تو میں اُسے محسوس نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ حسن کی درخشانی نے اب اُس کی جگہ لے لی تھی، اور اگر رات کی تاریکی شروع ہوگئی تھی تو مجھے اُسکا ہوش نہ تھا کیونکہ الماس کے روشن ترین ٹکڑے کسی سینہ کے اوپر سرخ ململی دوپٹہ کے نیچے اس شرح سے ساتھ میں جس حسن کے ساتھ دوشیزہ لڑکیوں کی قطار میں اس وقت آغوش شام میں جگمگا رہی تھیں۔ غرضکہ مجھے نہیں معلوم کہ شام کب ہوئی اور اگر شام اس کا نام ہے تو مجھے نہیں معلوم کہ اس ...

کی صبح سے آرزو کیونکر میرے دل میں جگہ پاسکتی ہے۔ بہرحال میرے
لئے عجیب و غریب سامانِ حیرت ونشاط یہاں موجود تھا اور میری سمجھ میں
نہیں آتا تھا کہ میں کس طرح اِس منظر میں فنا ہو جاؤں ——— وہی ہوا جو
ابھی ابھی سینکڑوں زلفوں سے دوشیزہ نکہت کو چھو چکی ہے، مجھ تک بھی
آرہی ہے! میرے لئے بھی مشام نواز ہے!! آہ، وہی بجلی کی روشنی
جس میں حسن، ایسے حسن، اسقدر حسن کی جلوہ طرازیاں شامل ہیں، مجھ پر
بھی پڑ رہی ہے، میرے رستہ عام پر بھی ضیا افگن ہے!! وہی زمین
جسپر ایسے ایسے نازک پیروں کے نشانات درس پرستش دے رہے
ہیں، اُف، اُسی زمین پر میں بھی چل رہا ہوں۔ سر کے بل چلنا اک ناقص اظہار
جذبات ہے اور خاک ہوکر وہی زمین میں مل رہنے کی تمنا نا ملک اعتراف
یہ تخیل کہ حیات، نفس حیات یعنی یہ زندگی، یہ متحرک حالت، ہمارے
اُن کے درمیان اِک کیفیت مشترک ہے! آہ، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر
اسکی قدر کی جائے، کس انداز سے اِس زندگی کا شکریہ ادا کیا جائے۔
ہر انسان اپنی جان کو عزیز سمجھتا ہے لیکن نہ اسقدر جتنا وہ انسان جو ساحلِ
اپالو پر شام کو تفریح کے لئے نکل جاتا ہے یہاں ہوکر اُسے معلوم ہوتا
ہے کہ وہی جان جس کی طرف سے اسکو اِک نوع کا تغافل تھا، یہاں اِک
مستقل حسن ہے، اِک نیرنگ ہے، مگر ہاں فرق یہ ہے کہ ہماری آنکھوں
میں وہ صرف اشک ہے اور اُنکی آنکھوں میں اِک جنبشِ سحر انگیز، ہمارے
سینوں میں وہ صرف آہ و فغاں ہے اور اُنکے سینوں میں شاہانہ غرور و
تمکنت، ہمارے جسم میں وہ صرف عجز و فتادگی ہے اور اُنکے قدموں میں
جمال و رعنائی +

ناپائداریٔ دنیا

جہاں رباطِ خراب است بر گذر گہِ سیل

غنچہ و گل کھلکر کملانا، شبنم کا نمودار ہوکر غائب ہونا، بہار کا خزاں سے وابستہ رہنا، صبح ہوکر شام ہوجانا، چاند کا بڑھکر گھٹ جانا، ہمیں جس و ہرِ ناپائدار کی اصلیت کو صاف بتا رہا ہے۔

اے گندم نما جو فروش دنیا! تیری خوش رنگ رنگینیاں، تیرے اشکالِ عجوبہ کی نو اظہاریاں، تیرے طلسمات جدیدہ کی سحر آفرینیاں، تیرے دلربا و دلکش مناظر کی خوبیاں، تیرے پُر زور مقناطیسی اثرات، تیرے حسین وجود دل کی کشش حسن و ادا، ایک عالم کو تیرے دام بلا میں پھنسانے کو کافی لیکن افسوس صد افسوس! تیری اصلیت فنائیت، تیرا وجود نابود، تیری ہستی نیستی، اور تیرا ہونا نہ ہونیکے برابر ہے۔ تیری ہر شے ہر کام بے اصل و ہیچ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ تجھے بقا نہیں پھر کیا وجہ ہے کہ تیری فنائیت کا راز پاکر بھی تیرے شیدائی، ظلم و تشدد کے نمونے، بیرحمی و سرکشی کے پتلے، حرص و ہوا کے متوالے ابدالآباد سمجھتے ہیں اور تجھ پر شیدا و مفتوں ہیں اور نہیں سمجھے کہ۔

شکاریم یکسر ہمہ پیشِ مرگ

ہاں اے بے وفا ناپائدار دنیا ہماری چشم عبرت ہوشیار و خبردار ہے ہمارے گوش حسرت سن چکے ہیں کہ تجھ میں بڑے بڑے شریف النفس، با وفا،

اولوالعزم شہنشاہ، اور ہزارہا نازنینان جہاں صرف فنا ہوجانے کو پیدا ہوئے اور ہمکو خوب معلوم ہے کہ ہزارہا ہستیاں عالم ہوائیت کی صرف تجھ میں آکر نیست ونابود ہوجانیکی منتظر ہیں۔ تیرا ہر ذرہ ہستی وفنائیت کا سیدھی راہ ہے۔

آہ! اگر تیری ہستی کا کچھ بھی قیام واعتبار ہوتا تو آج بڑے بڑے شاہیر، ناموران زماں کا کچھ پتہ لگتا لیکن افسوس!

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

اے بیرحم وسنگدل دُنیا، تونے بڑے بڑے سیم تن، نازک بدن، خوش ادا با حیا وپاکباز حسینوں کو اپنے آغوش شفقت میں پالا، پرورش کیا۔ اور پھر اپنے ہی ناز پروردوں کو زمانے نے اُس شہ زور پنجہ تظلم وتشدد میں دے دیا کہ جنے اُن نازک تنونکو خاک میں ملا کر چھوڑا اور آج خفتگان زیر زمین کا نام ونشان تک نہیں ملتا چشم عبرت اُن نازک بدن حسینوں کے مرقدونپر چار آنسو بہانے کو ملیا ہے اور عبرت وتنبیہ زبان حال سے گویا ہے۔

خوشی سے دیکھیو حرکت میں آئیو نہ بہت
زمین تجھ میں ہزاروں حسین سوتے ہیں

چمنستان دہر میں کو نسے پھول کھلے جو کمہلا نہ گئے، آہ! وہ ننھے ننھے پودے جو بہار کے زیر سایہ آغوش چمن میں، باد نسیم نرم نرم جھوکونسے بصد وقت و مشکلات پلکر بڑھے، افسوس کہ انقلاب زمانہ کے ہاتھ سے رہائی نہ پا سکے، باد خزاں کے تھپیڑوں کے متحمل نہ ہوکر کمہلا گئے اور اُس چمن آباد کو جو فخر جناں تھا ویران وبرباد بنا گئے۔

کدام باد بہاری وزید در آفاق   کہ باز در عقبش آفت خزانی نیست

حباب ہستی کو بحر جہاں میں فنائیت کے طوفان سے امن نہیں عالم ہیولا سے عالم وجود میں نمودار ہونا نیستی و فنائیت کے لئے تیار ہونا ہے۔ کاروانسرائے دنیا میں قیام پذیری ملک عدم کو جانے کی تیاری ہے۔

افسوس اس ہستی و نیستی کی حقیقت، اسکا مقصد اصلی، اسکا راز مخفی باشندگان عالم بقا سے ملنا مشکل ہی نہیں محال ہے شاید کہ رہروان ملک عدم ہی کچھ بتا سکیں لہس ملتجی ہیں کہ۔

دُنیا سے جانے والو کچھ تم ہی بتاتے جاؤ
اس دشت غم میں کس لئے آئے تھے کیوں چلے

آہ! معلوم ہوا کہ اس کاروانسرائے ہزاروں گھر بگڑ جانے کو بنے، ہزاروں خاندان بسٹ جانے کو ہوئے، ہزاروں آبادیاں برباد ہونیکو ہوئیں افسوس! اے دُنیائے فانی کوئی تجھ میں پھول پھلکر نیست و نابود ہونے سے نہ بچ سکا، کوئی خوشی و راحت مبدل بہ رنج و کلفت ہونے سے نہ رُک سکی۔ تیری اصلیت دیکھلی، اے بے ثباتی دنیا تیرا انجام دیکھ لیا۔ اے ویرانہ آباد دنیا تجھ میں نیستی و فنائیت کے سوا کچھ نہیں ؎ شعر

بسی گور غریباں جب کسی کا گھر ہوا ویراں
مسافر پڑ کے سوئے جاگ اُٹھی تقدیر منزل کی

نصیر الدین احمد

طبیب یہ رسالہ طبیب ہفتہ وار کا بدل ہے جو حکیم علی رضا کی ایڈیٹری سے شائع ہوتا ہے اسکی نسبت ہمکو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ملک کو جسقدر اس قسم کے رسالوں کی احتیاج ہے وہ ناقابل اظہار ہے ہمیں مسرت ہوئی کہ طبیب پھر زندہ ہو گیا خدا کرے وہ مسیح النفس ثابت ہو قیمت کے لحاظ سے لکھائی چھپائی اچھی ہے حکیم علی رضا کو چھیاسی پی کر

اعتزال

(حضرت نیاز فتحپوری)

آج کل مسلمانوں میں جہاں اور بہت سی اعتقادی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، وہاں معلومات کی خامیاں بھی بہت ہیں، اور غالباً یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ معلومات کی کمی بڑا سبب اُن اعتقادی کمزوریوں کا ہے، بہت سے الفاظ ہم ایسے بولتے ہیں، جن کا مفہوم اپنے پندار میں صحیح سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مفہوم بالکل غلط ہے، اور اس لیے اُس مفہوم کے لحاظ سے جو نتائج ہمنے نکالے ہیں، وہ بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ ہمارے اذہان ایک اضطراری صورت میں اُس لفظ کے نکلتے ہی متاثر ہو جاتے ہیں اور ہم اُس تاثر کی وجہ سے جس کی علت ہی شروع سے باصل بے بنیاد ہے، بعض دفعہ ایسی غلطی کر بیٹھتے ہیں، جو ہرگز ہمارے شایاں نہیں ہے، اور غالباً ہم اُسے نہ کرتے، اگر ہماری معلومات وسیع ہوتی، آجکل جبکہ مذہبی اعتقادات نے کچھ عجیب و غریب صورت اختیار کرلی ہے، اور مذہب کو خدا معلوم کیا سمجھ رکھا ہے، بہت ضرورت اس امر کی ہے کہ بعض ایسے اُمور پر روشنی ڈالی جائے، جن سے وہ غلط فہمی دُور ہو، اور عام پبلک اِس بات کے سمجھنے کا شعور پیدا کرے کہ جو کچھ مُنہ سے کہا جائے، پہلے اُس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ مسلمانوں کے اُس طبقہ میں بھی جو معمولی پڑھا لکھا ہے غالباً کوئی فرد ایسا نہیں جو الفاظ اعتزال و معتزلی سے واقف نہ ہو، لیکن اگر کسی سے سوال کیجئے کہ اعتزال کیا ہے اور معتزلی کسے کہتے ہیں تو وہ سوائے اس کے اور کچھ نہ کہہ سکیگا کہ اعتزال دہریت کو کہتے ہیں۔ اور معتزلی دہریہ کو۔ پھر دہریت د

دہریہ کی نسبت پوچھئے تو وہ بجائے نہایت صاف الفاظ میں کہدیگا کہ یہ بے دین آدمیوں کا ذکر کرتے ہو۔ غرضکہ اس نشتر کرنے سے یہ نتیجہ نکلا کہ معتزلی اُن کے پندار میں بے دین ہے اور اسلام سے خارج۔ لیکن اگر اُس شخص کو کسی طرح یقین دلا دیا جائے کہ جو کچھ وہ سمجھا ہے صحیح نہیں ہے۔ یا کسی معتزلی کو اسلام سے خارج کر دینا نا درست ہے تو اُسکو اپنے علم و یقین پر کس قدر محجوب ہونا پڑے گا۔ لہذا آج کی اشاعت میں ہم بتانا چاہتے ہیں کہ اعتزال کسے کہتے ہیں اور معتزلی کس چیز کا نام ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اعتزال کی بنیاد صحابہ کرام کے اخیر زمانہ میں پڑی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابتدائے اسلام ہی سے اُس کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ جس کی تصریح آگے آئیگی۔ اُسوقت تک کہ آنحضرت کی ذات مقدس اس عالم میں رہی۔ مذہب نہایت اجمالی اور سادہ حالت میں رہا۔ عقاید کی تنہا تعلیم کلمہ توحید کا پڑھا دینا تھا اور اعمال کی نسبت فرائض خمسہ سے آگاہ کر دینا بس کرتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس عہد مبارک میں جبکہ مبلغ حقیقی موجود تھا۔ اِس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہ تھی اور نہ علایق کی وسعت نے اسلام کو مجبور کیا تھا کہ وہ اس سے زیادہ مذہب کی نسبت کچھ جاننے یا جاننے کی کوشش کرے۔ آنحضرت کے بعد جب اسلام کا دوسرا دور شروع ہوا اوسوقت بھی مصروفیت کا وہی عالم تھا کیونکہ روم و فارس کے معرکے پیش نظر تھے۔ اور کوئی صورت نہ تھی کہ فرزندان عرب کے دماغی و عملی انہماک کا رجحان کسی دوسری طرف ہوتا۔ لیکن جب اسلام نے زیادہ وسعت اختیار کی اور دوسری قومیں اسمیں آ آ کر شامل ہونے لگیں تو وہ زمانہ آیا۔ جب اعتقادات و اعمال کے متعلق نسبتاً کچھ زیادہ غور و تعمق کی ضرورت پڑی۔ اور یہی وہ ضرورت تھی جسنے ابتدائی تعلیم کی وہ سادگی چھین لی۔ اور مذہب میں عقل کا در خور شروع ہوا۔

چنانچہ صحابہؓ کے زمانہ تک اعتقادات میں جو اختلاف ہوئے انمیں سے چند یہ ہیں۔

(۱) اکثر صحابہ معراج جسمانی کے قایل تھے۔ حضرت عایشہؓ کو اس سے انکار تھا۔

(۲) عبداللہ بن عباس کا یقین تھا کہ رسول اللہ نے خدا کو دیکھا۔ حضرت عایشہؓ کا عقیدہ اسکے خلاف تھا +

(۳) ابو ہریرہؓ اس بات کے قایل تھے کہ رونے پیٹنے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے حضرت عایشہؓ مخالف تھیں +

(۴) عبداللہ بن عمر سماع موتے کے قایل تھے (یعنی اس بات کے کہ مردہ سنتا ہے) اور بعض صحابہ اس کے خلاف تھے +

اور یہ عقاید میں ہی نہیں۔ اعمال میں بھی اختلاف پیدا ہوا۔ چنانچہ وضو اور مسایل وضو میں مختلف اصحاب کے اقوال تھے۔ مگر ان جزئی اختلافات سے کوئی ایسی تفریق نہیں کی تھی۔ جس سے یہ حکم لگایا جاتا کہ مذہب کے دو یا زاید فرقے ہوگئے ہیں۔ سب مسلمان تھے اور مسلمان سمجھے جاتے تھے +

اب حضرت علیؓ کا آخر زمانہ آیا (شاید ۳۷ھ ہجری) جب انھوں نے حکم کے فیصلہ سے اتفاق کرکے امیر معاویہ سے صلح کر لی۔ لیکن خود انھیں کے بہت سے ساتھیوں نے اس صلح سے روگردانی اختیار کی۔ مذہب میں لا حکم الا اللہ حق و باطل کی تمیز میں ثالث کا فیصلہ کیا؟ چونکہ انھوں نے جمہور مسلمانان سے انحراف کیا۔ اسلیئے یہ لوگ حضرت علیؓ کے دایرہ سے خارج سمجھے گئے۔ اور اسطرح اسلام میں اول اول دو فرقے پیدا ہوگئے۔ یعنی وہ لوگ جو حضرت علی سے علیحدہ ہوگئے خارجی سمجھے گئے اور وہ جو ان کے ساتھ رہے شیعہ بن گئے۔ اور حقیقتاً یہ وہ تفریق تھی جس کے اندر باطل یا بالعکس کام کر رہی تھی۔

اسکے بعد بنو امیۃ کا زمانہ شروع ہوا۔ اور وہ وقت آیا جب مذہب کی آڑ میں حکمرانی کی ہوسیں پوری کی گئیں۔ اور استحکام سلطنت کے لیئے سخت خونریزیاں اور سفاکیاں ہونے لگیں۔ ہر چند عرب میں وہ آزادی تو باقی نہیں رہی تھی جو رسول اللہؐ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں تھی۔ تاہم اس قدر جرأت تھی کہ وہ افسران سلطنت سے کبھی کبھی سوال کر بیٹھتے تھے کہ تم مسلمان ہوکر کیونکر یہ خونریزیاں روا رکھتے ہو؟ جس پر انھیں یہ جواب ملتا تھا کہ "ہم کچھ نہیں کرتے ہیں۔ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے" چنانچہ انھیں سوال کرنے والوں میں ایک شخص معبد جہنی بھی تھا۔ وہ حضرت حسن بصری کی خدمت میں گیا اور اس مسئلہ کی نسبت کہ کیا "القدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ" کا یہی مطلب ہے۔ اُن کی رائے دریافت کی۔ انھوں نے جواب دیا کہ کذب اعداء اللہ "خدا کے دشمن جھوٹے ہیں" یہ تھی اعتزال کی اصلی بنیاد۔ اور یہ تھا اُسکا مختصر سا منبع جس نے آگے چلکر دنیا میں بڑا اثر پیدا کیا۔ اور ایک مستقل جدا مسلک ہو گیا +

چنانچہ سب سے پہلا مسئلہ اعتزال جس سے مذہب اعتزال کی تاریخ شروع ہوتی ہے یہی مسئلہ قدر ہے کہ "انسان جو برائیاں کرتا ہے وہ خود کرتا ہے، خدا نہیں کراتا"

اور اسی بنا پر معتزلین کو قدریہ بھی کہتے ہیں معبد جہنی نے سب سے پہلے اس مسئلہ کی اشاعت کی، اور اس فرقہ کا نام قدریہ رکھا، کیونکہ خدا کا عادل ماننا اسی اعتقاد پر مبنی ہے کہ انسان اپنے افعال میں مختار مانا جائے۔ چونکہ معبد جہنی حکومت بنی امیہ کا شدید مخالف تھا، اور اس مسئلہ کا تعلق ہی یک گونہ پالٹکس سے ہے اسلیئے عبد الملک بن مروان نے ۸۰ھ میں حجاج کے ہاتھ سے اُسکو قتل کرا دیا، اور اسطرح اس بانی اعتزال کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا، لیکن ابھی تو اس

مذہب کو بہت ترقی کرنی تھی اس لیئے معبد کے بعد غیلان دمشقی نے جو قبطی النسل تھا۔ اس مسئلہ کو رواج دیا، اور اسکے ساتھ ہی ایک مسئلہ امر بالمعروف والنھی عن المنکر کا شامل کر لیا، مگر یہ مسئلہ اور بھی حکومت کے خلاف تھا، اور یہ نہایت بے باکی سے علان کرتا تھا اسلیئے ہشام بن عبد الملک نے دمشق بلاکر اسے پھانسی دیدی۔ ہرچند معبد و غیلان بہت کم زندہ رہے لیکن اسی قلیل زمانہ میں ہزاروں آدمیوں نے یہ مذہب قبول کر لیا۔ اور اسکے اصول قلمبند ہوکر شائع کئے جانے لگے۔۔۔۔ قبل اسکے کہ ہم غیلان کے بعد کے حالات لکھیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معبد جہنی کے اس پرجوش و سرگرم ارادتمند کا ذکر ذرا تفصیل سے کریں، تاکہ بآسانی سے معلوم ہو سکے، کہ بانیان اعتزال کی اخلاقی حالت کیا تھی، جو خلاف تعلیم اسلام ہے۔ یہ ابھی ابھی ہم لکھ چکے ہیں کہ وہ قبطی النسل تھا اور دمشق اسکا مسکن تھا۔ اس نے علم کلام تکمیل حسن بن محمد بن حنفیہ سے کی تھی۔ یہ اپنے زمانہ کے ایسے مشہور علماء و اکابر حکماء میں سے تھا کہ حسن بصری جب اسکو دیکھتے تو کہتے کہ "اترون ھذا ھو حجۃ اللہ علی اھل الشام" یعنی یہ شخص اہل شام کے لئے اللہ کی حجت ہے۔ پھر یہی نہیں کہ ظاہری علوم کا ماہر ہو، زہد و تقوی، اور اعلائے کلمۃ اللہ میں بھی ایسا بیباک و آزاد تھا کہ اُس زمانہ میں بھی اوس کی کوئی نظیر نہ تھی۔ چنانچہ اوسکی وہ تحریر دیکھنے کے قابل ہے۔ جس میں اوس نے خلیفہ عمر بن عبد العزیز کو لکھا ہے کہ:-

"خدا نے اسلام کی امامت کی دو تقسیمیں کی ہیں یعنی بعض امام تو ایسے ہیں جن کی نسبت فرماتا ہے کہ "وجعلنا ھم ائمۃ یھدون بامرنا"، اور بعض امام ایسے ہیں جن کی نسبت "وجعلنا ھم

ائمۃ یدعون الی النار" فرماتا ہے، پس سمجھ لو کہ تم کس تقسیم میں ہو۔
اُمت تم سے نجات پانے والی ہے یا ہلاک ہونے والی"
پھر جس وقت عمر بن عبد العزیز نے اُس سے بلا کر کہا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم نظام
سلطنت میں میری مدد کرو اور کوئی خدمت قبول کرو، تو اوس نے صاف کہدیا
کہ مجھے سارے توشہ خانہ سپرد کر دیجئے، تاکہ جتنی فضول و نمائشی چیزیں
ہیں اون کو بیچکر روپیہ لوگوں کو واپس دیدوں، یہ منظور کیا گیا، اور وہ مہتمم توشہ
خانہ بنا دیا گیا۔ اُس نے اس خدمت کو ہاتھ میں لیتے ہی وہی کرنا شروع کیا جو
اُسنے کہا تھا۔ چنانچہ صرف پشمین موزے جو اسی غرض سے باہر نکالکر
رکھے گئے تھے۔ ان کی قیمت تیس ہزار درہم تھی۔ غیلان ایک ایک چیز
کو اٹھاتا جاتا تھا۔ اور بآواز بلند کہتا جاتا تھا کہ:۔
"آؤ اُن کے مال پر جو غاصب تھے، آؤ ان کے مال پر جو ظالم و غاصب تھے
آؤ ان کے مال پر جو رسول خدا کے بعد اُسکی سیرۃ و سنت کو بھلا بیٹھے
لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت و ایمان کے پیشوا اور دین و ملت کے امام
تھے حالانکہ مسلمان اُن کے ظلم و ستم کی بدولت تنگدست و پریشان ہیں"
ھشام بن عبد الملک نے جب وہ تخت نشین ہوا۔ یہ سب باتیں
سُنی اور ارادہ کر لیا کہ اس شخص کو جو اُسکے اسلاف کے کارنامے یوں آزادی
و دلیری سے بیان کرتا ہے، زندہ چھوڑنا قرین مصلحت نہیں ہے، چنانچہ
یہی ہوا کہ ایک دن جبکہ غیلان اپنے شاگرد صالح دمشقی کے ساتھ ملک
آرمینیا جا رہا تھا ہشام کے سپاہیوں نے انھیں گرفتار کر لیا۔ چند دن قید
میں رکھنے کے بعد اُس کے ہاتھ پاؤں کٹوا دئے گئے، لیکن اُس کا یہ عالم تھا
کہ خون کے فوارے جاری تھے اور وہ برابر یہی کہہ رہا تھا کہ:۔

"خدا انہیں ہلاک کرے، یہ وہ لوگ ہیں جو حق کو مردہ اور باطل کو زندہ کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جو عزت دیتے ہیں اُن لوگوں کو جنکو اللہ نے ذلیل کیا، اور ذلیل کرتے ہیں اُن کو جنھیں خدا نے عزت دی"

ہشام سے ایک مصاحب نے کہا کہ اسکی فصاحت سے لوگوں کو رُلا رکھا ہے ضرورت تو زبان کاٹنے کی تھی۔ چنانچہ اوس کی زبان بھی کاٹ دی گئی اور وہ اس طرح تڑپ تڑپ کر مر گیا، بعض مورخین کا خیال ہے کہ بعد کو پھانسی کے ذریعہ سے اسکی جان لی گئی۔

بہرحال اِس مختصر بیان سے یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ وہ کتنا سچا مسلمان کیسا مستحکم عقیدہ رکھنے والا مومن تھا، حقیقت وخلافت کے اعلان میں کس درجہ دلیر و بیباک اور پاکیزگی اخلاق کا کیسا اچھا نمونہ تھا۔

غرضکہ جب معبد و غیلان دونوں نہ رہے، تو خیال یہ تھا کہ اُن کی یادگار قائم رکھنے والا کوئی نہ ہوگا۔ لیکن خدا کی شان اسی زمانہ میں دو شخص اور نمودار ہوگئے۔ جنہوں نے علم اعتزال کو اپنے ہاتھ میں لیکر اور زیادہ شہرت دی۔ یہ عمرو بن عبید اور واصل بن عطا تھے جو ایک ہی سنہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اِن کا حال بھی ذرا تفصیل سے سننے کے قابل ہے ✦

(۱) عمرو بن عبید کی کنیت ابوعثمان تھی۔ اور اسکا باپ عبید بصرہ میں سپاہی تھا۔ عمرو کی طبیعت شروع ہی سے زہد و عبادت کی طرف راغب تھی حالانکہ اسکا باپ ایک رندمشرب سپاہی وضع آدمی تھا۔ جب باپ بیٹے دونوں باہر نکلتے تو لوگ کہتے "دیکھو کیا اللہ کی شان ہے، عبید سے جو شرالناس ہے، عمرو کو پیدا کیا جو خیرالناس ہے۔ عبید سُنتا تو کہتا "ہاں تم لوگ سچ کہتے ہو۔ یہ ابراہیم ہے اور میں آذر ہوں۔ جاحظ کا بیان ہے کہ عمرو نے چالیس برس تک صبح کی نماز

مغرب کے وضو سے پڑھی اور چالیس حج پیدل چلکر کیے، وہ دنیا اور اہل دنیا سے بالکل مستغنی تھا، اور اسی بے نیازی کی وجہ سے وہ بڑا حق گو تھا، چنانچہ ایک دفعہ عبداللہ بن عمر امیر عراق نے اپنے بصرہ کے عامل شبیب کو لکھا کہ اپنے شہر کی جماعت علماء کو میرے پاس بھیجو، جس میں عمر بن عبید کا ہونا ضروری ہے، شبیب نے بلاکر ان سے کہا کہ جائیے، انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ "تم جانتے ہو عبداللہ بن عمر کا پہلا سوال یہی ہوگا کہ تمہارا حاکم کیسا ہے، اور تم سمجھتے ہو کہ میں تمہاری نسبت اُس کے جواب میں کیا کہوں گا"

ایک واقعہ اور خلیفہ منصور عباسی کے عہد کا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر کیسا عجیب و غریب شخص تھا، جب منصور تخت نشین ہوا تو عمر کو بلاکر اپنے برابر مسند پر بٹھانا چاہا، لیکن وہ نہیں بیٹھا اور جو نصیحت اُس نے کی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے،

"یہ حکومت جو آج تجھے نصیب ہے۔ تجھ سے پہلے کسی اور کے پاس تھی، یاد رکھ کہ اگر دولت و حکومت کسی کے ساتھ وفا کرتی تو تجھ تک نوبت نہ آتی۔ اسلیئے آج کی رات اُس دن سے ڈر جس کے بعد کوئی رات نہیں ہے"

جب عمر دربار سے اُٹھنے لگا تو منصور نے کہا میں نے آپکے لیئے دس ہزار درہم کا حکم دیا ہے۔ عمر نے جواب دیا مجھے اُسکی حاجت نہیں، منصور نے کہا "قسم خدا کی آپ کو یہ نذر قبول کرنا پڑے گی" عمر نے کہا "قسم خدا کی میں کبھی منظور نہیں کروں گا" یہ سُن کر منصور کا بیٹا مہدی بول اُٹھا کہ "افسوس تم امیرالمومنین کی قسم پر قسم کھاتے ہو" عمر نے منصور سے پوچھا یہ کون ہے۔

اُس نے جواب دیا کہ یہ میرا بیٹا ولیعہد مہدی ہے۔ عمر نے کہا " واللہ تم نے اسکو وہ لباس پہنایا ہے جو شریفوں کا لباس نہیں ہے۔ اور ایسا نام رکھا ہے جسکے لائق وہ نہیں ہے پھر مہدی سے مخاطب ہوکر کہا کہ " تیرا باپ قسم کا کفارہ ادا کرسکتا ہے۔ لیکن میں نہیں کرسکتا " اس کے بعد منصور نے پوچھا کہ کوئی حاجت تو فرمایئے۔ عمر نے جواب دیا کہ " میں اب آئندہ مجھے دربار میں بلانے کی زحمت نہ اٹھایئے۔ منصور نے کہا تو اب میں آپ سے نہ مل سکونگا " اس نے کہا " ہاں بس میری حاجت یہی ہے " اور یہ کہکے چلدیا۔

راستبازی میں وہ اس درجہ مشہور تھا کہ ملکی معاملات میں بھی نہایت خطرہ کیوقت اُس کی بات کا اعتبار کیا جاتا تھا، چنانچہ جب نفس ذکیہ نے منصور پر خروج کیا اور بصرہ آیا تو منصور کی خبر لگی اور سیدھا بصرہ جا پہنچا لیکن نفس زکیہ چلا گیا تھا منصور کو سخت تشویش تھی کہ ٹھیک پتہ کیسے معلوم ہو اتفاق سے عمر کے دوست زبردستی گھسیٹ کے منصور کے پاس لے گئے۔ اُس نے فوراً عمر سے پوچھا کہ کیا کوئی شخص بصرہ میں ایسا ہے جس سے ہماری حکومت خطرہ میں ہو۔ عمر نے کہا " نہیں " منصور یہ سنتے ہی نہایت اطمینان سے واپس چلا گیا،

ایک شخص نے عمر سے مسئلہ قدر پر بحث کی۔ اُس نے جواب دیا کہ اس مسئلہ میں جو کچھہ خدا نے فرمایا ہے وہ مسلمانوں کے اطمینان کے لیئے کافی ہے۔ خدا نے فرمایا ہے " فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ " یعنی ہم اُن سے اُن کاموں کا سوال کرینگے جو وہ کرتے تھے۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو کچھ ہم نے اُن کی تقدیر میں لکھدیا ہے اسکا سوال کرینگے، اور اس سے خدا کا عدل اور انسان کا اپنے افعال میں مختار ہونا ثابت ہوتا ہے مثلے

کسی کی ملامت و تعریف کی بھی پرواہ نہ تھی۔ چنانچہ اس سے ایک شخص نے کہا، مجھے تم پر رحم آتا ہے، جب لوگ تمہیں برا کہتے ہیں۔ عمرو نے کہا، کبھی تم نے میری زبان سے بھی ان کی نسبت کچھ سنا ہے۔ جواب ملا، کبھی نہیں، عمرو نے کہا پھر تمہیں ان کی حالت پر رحم آنا چاہیئے نہ کہ مجھ پر۔ اس نے [illegible] برس کی عمر پائی، اور بڑے بڑے نامور شاگرد جیسے خالد بن صفوان، طلحہ بن زید، ابراہیم بن یحییٰ (جو امام شافعی کے استاد تھے) وغیرہ اپنے بعد چھوڑے۔ غالباً اس کا حال بیان کرنے کے بعد ہمیں یہ بات ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کیسا شخص تھا۔ یا یہ کہ وہ مسلمان بھی تھا یا نہیں +

عمرو بن عبید کے ساتھیوں میں واصل بن عطا بھی تھا، یہ بھی اسی سال پیدا ہوا تھا جس سال عمرو عالم وجود میں آیا۔ اس کی کنیت ابو حذیفہ تھی اور لقب غزال۔ ہر چند اس کی پیدائش مدینہ منورہ میں ہوئی تھی لیکن تعلیم و تربیت بصرہ میں ہوئی اور یہیں یہ جوان ہوا۔ یہ اپنے زمانہ کا ایسا فاضل اجل تھا کہ سارے عرب میں اس کی فصاحت و بلاغت ضرب المثل تھی، وہ اتفاق سے الثغ تھا (یعنی حرف را اس سے ادا نہیں ہو سکتا تھا) اور اسی لیئے اکثر خاموش رہتا تھا۔ مگر اس کی قادر الکلامی اور ادبی مہارت کا یہ حال تھا کہ جب کبھی مجالس و مجامع میں خطبہ دینے کھڑا ہوتا تھا تو باوجود اس کے کہ وہ نہایت روانی و بے ساختہ پن سے بولتا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ کہیں دوران تقریر میں حرف ر آجائے۔ چنانچہ ایک شخص نے اس سے سوال کیا کہ اگر یہ کہنا مقصود ہو کہ گھوڑے پر زین کسو تو "اسرج الفرس" کی جگہ تم کیا کہو گے۔ واصل نے فوراً کہا "البد الجواد"، پھر ایک شخص نے پوچھا کہ اگر یہ کہنا مقصود ہو کہ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنے نیزہ کو تانا، تو وہ مرکب [illegible]

وجود رہے۔ کی جگہ کیا کہو گے۔ اُس نے بے ساختہ جواب دیا کہ میں کہونگا "استوی علی جوادہ وسحب عاملہ" اور یہ خصوصیت اس کی ایسی مشہور ہو گئی تھی کہ شعرا اپنے قصائد میں اسکا ذکر کرنے لگے۔ چنانچہ ابو محمد قاذن نے اپنے ممدوح کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے اُسکا ایک شعر ہے کہ ؎

نعم تجنب "لا" یوم العطاء کما
تجنب ابن عطاء لثغة الراء

(یعنی میرا ممدوح فیاضی کے دن "نہیں" کہنے سے ایسا ہی بچتا ہے۔ جیسا واصل بن عطا الثغ ہونے کی وجہ سے حرف ر سے بچتا تھا)

اس نے علم کلام ابو ہاشم بن محمد بن حنفیہ سے سیکھا تھا۔ چونکہ وہ اکثر خاموش رہا کرتا تھا۔ اسلئے لوگ گونگا سمجھنے لگے تھے۔ لیکن اُسکے علم و فضل کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دن عمرو بن عبید کے پاس جا نکلا۔ عمر نے لوگوں سے خطاب کر کے کہا کہ "لوگ جسے گونگا سمجھتے ہیں حالانکہ شیعہ، خوارج، ملاحدہ، اور دہریہ وغیرہ کے مذہبی عقاید و اصول کا جاننے والا اور دلایل سے اُن کا رد کرنے والا شخص اگر کوئی دنیا میں ہے تو واصل بن عطا ہے۔"

اس نے اپنے شاگردوں کو چاروں طرف خراسان و افریقہ، کوفہ، و آرمینا کی طرف بھیجا۔ اور مذہب اعتزال کو شہرت دی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اعتزال کا اثر تمام ممالک میں دوڑ گیا۔

واصل و عمر دونوں حسن بصری کے حلقہ درس میں بمقام بصرہ شریک ہوا کرتے تھے، وہ زمانہ وہ تھا جب خوارج کے اس مسئلہ کا کہ وہ گناہ کبیرہ کا

مرتکب کافر ہے" بڑا زور شور تھا۔ حسن بصری کی مجلس میں جب اسکا ذکر آیا تو واصل نے کہا کہ میں تیسری شق اختیار کرتا ہوں یعنی دو گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ کافر ہے نہ مسلمان" اسپر حسن بصری نے اظہار غصہ کیا اور یہ دونوں وہاں سے اٹھ آئے اور اسی مسجد میں اپنا دوسرا حلقہ درس قایم کیا۔ حسن بصری کے حلقہ سے الگ دیکھ کر لوگوں نے انہیں معتزلہ کہنا شروع کیا اور اس لقب کے ایجاد کا یہ پہلا دن تھا۔ اسکا ایک مناظرہ عمرو بن عبید سے بڑا پرلطف ہے:-

"ایک روز حسن بصری کے درس گاہ میں واصل و عمرو دونوں موجود تھے واصل نے عمرو سے کہا کہ تم گناہ کبیرہ کرنے والے مسلمان کو منافق کیوں کہتے ہو"

عمرو:- اس لیے کہ خدا فرماتا ہے "والذین یرمون المحصنت ثم لم یاتوا باربعة شهداء فاجلدوا هم ثمانین جلدة ولا تقبلوا لهم شهادة ابدا و اولئک هم الفاسقون" اور دوسری جگہ فرماتا ہے ان المنافقین هم الفاسقون اسلیئے ہر فاسق منافق ہے کیونکہ فاسق پر الف لام تعریف کا داخل ہے،

واصل:- خدا تو یہ بھی فرماتا ہے کہ "ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم الظالمون" اور تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ صاحب کبیرہ کو ظالم کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ اُسے فاسق کہہ سکتے ہیں۔ پھر تم نے خدا کے اس قول سے کہ الکافرون هم الظالمون صاحب کبیرہ کی تکفیر کیوں نہیں کی جبکہ یہاں بھی لفظ ظالم پر الف لام تعریف کا داخل ہے۔ پس جس طرح تم یہ نتیجہ نکالتے ہو کہ ہر فاسق منافق ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہو کہ ہر ظالم یعنی مرتکب کبایر کافر ہے، حالانکہ تمام علماء اسپر متفق ہیں کہ صاحب کبیرہ کافر نہیں ہے"

عمرو یہ سنکر چپ ہوگیا۔ پھر واصل نے کہا "اہل قبلہ کے مختلف گروہ جس بات پر متفق ہیں وہ قابل تسلیم ہے یا جس میں اُن کا اختلاف ہے؟"
عمرو نے جواب دیا کہ "وہی بات قابل تسلیم ہے جسپر سب کا اتفاق ہو" واصل نے کہا "تمام اہل قبلہ صاحب کبیرہ کو فاسق کہنے میں متفق ہیں، چنانچہ خوارج مرتکب کبیرہ کو فاسق مشرک کہتے ہیں۔ شیعہ فاسق کافر نعمت کہتے ہیں حسن بصری فاسق منافق کہتے ہیں اور مرجیہ فاسق مومن"۔ پس فاسق کہنے میں سب کا اتفاق ہے، اور باقی ناموں میں اختلاف ہے۔ اسلیے متفق علیہ نام فاسق اختیار کرنا چاہیئے۔ پس صاحب کبیرہ کو نہ مومن کہہ سکتے ہیں نہ منافق۔ نہ مشرک نہ کافر۔ بلکہ صرف فاسق کہہ سکتے ہیں،
عمرو نے یہ سنکر کہا کہ "میں حق کا دشمن نہیں ہوں۔ تمہارا قول صحیح ہے سب لوگ اسپر گواہ رہیں کہ میں واصل کے قول کو تسلیم کرتا ہوں"
عبداللہ بن حسن کے دونوں بیٹے محمد و ابراہیم جو خاندان اہل بیت سے تھے مسئلہ قدر میں واصل کے پیرو تھے۔ ایکدفعہ عبداللہ بن حسن نے اپنے بیٹے محمد سے مخاطب ہوکر کہا کہ تمہاری تمام باتیں پسندیدہ ہیں مگر افسوس کہ تم مسئلہ قدر میں واصل کے پیرو تھے۔ ایکدفعہ عبداللہ بن حسن نے اپنے بیٹے محمد سے مخاطب ہوکر کہا کہ تمہاری تمام باتیں پسندیدہ ہیں مگر افسوس کہ تم مسئلہ قدر کو مانتے ہو، اور اوسپر اعتقاد رکھتے ہو۔ محمد نے کہا "ابا جان میرا یہ عقیدہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو میں اسکے چھوڑ دینے پر قادر رہوں یا نہیں اگر قادر رہوں تو یہی میرا مذہب ہے۔ اور اگر قادر نہیں ہوں تو پھر یا امر سب سے کا ہے"۔ عبداللہ بن حسن نے کہا۔ اب کبھی تم پر خفا نہ ہونگا"
غرضکہ علم کلام کا پہلا موجد یہی ہے اور پھر ایک علم کلام گیا۔ اصول

فقہ کے مہمات اصول اس نے بیان کئے۔ ملحدوں کا رد اول اسی نے کیا، مسائل فقہیہ کے چار ماخذ قرآن، حدیث، اجماع۔ قیاس، اول اسی نے قرار دیئے یہ مسئلہ کہ "نسخ احکام میں ہو سکتا ہے نہ کہ اخبار میں" اول اول اسی نے بیان کیا۔

غرضکہ عمرو اور واصل فضل وکمال میں عدیم المثیل اور مذہب اعتزال کی بنا مستحکم کرنے والے تھے۔ اور پھر زہد و ورع کی یہ حالت کہ ایکدفعہ حسن بصری سے کسی شخص نے عمرو کی نسبت سوال کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ تم ایسے شخص کی نسبت کیا سوال کرتے ہو جس کو گویا فرشتوں نے ادب دیا ہے اور انبیاء نے اسکی تربیت کی ہے۔ میں نے اوس سے زیادہ کسی کے ظاہر و باطن کو یکساں نہیں پایا"

بہرحال ان دونوں کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب اعتزال نے بہت وسعت اختیار کرلی اور بہت سے دقیق مسائل علاوہ مسئلہ قدر کے شامل ہوگئے رفتہ رفتہ دربار خلافت میں بھی اسکا ذکر ہونے لگا۔ اور آخرکار یزید بن ولید بن عبدالملک نے علانیہ یہ مذہب قبول کرلیا۔ بنو امیہ میں یہ پہلا خلیفہ تھا جس نے اعتزال کی حمایت کی۔ اسکے بعد ولید بھی معتزلی رہا۔ یہانتک کہ ۱۲۶ھ میں ولید مر گیا اور اس کے ۶ برس بعد ۱۳۲ھ میں دولت بنو امیہ کا خاتمہ ہی ہوگیا۔

جب دولت بنو امیہ ختم ہوگئی، اور خاندان عباسیہ نے اس کی جگہ لے لی، تو عقاید اعتزال جو بنو امیہ کے زمانہ میں ایسا مستحکم نشو و نما پا چکے تھے، اس قدر جلد فنا نہیں ہوسکتے تھے کیونکہ ان کا تعلق اگر ایک طرف بادشاہان بنی امیہ سے تھا، تو اس سے زیادہ دوسری طرف عام پبلک سے تھا، اور جیسا آگے چلکر معلوم ہوگا گو اس خاندان کے بعض بادشاہوں نے اعتزال کی بنیاد متزلزل کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا، لیکن خدا کی شان ہے، کہ بعض افراد

حکومت ایسے بھی پیدا ہوئے جن کی وجہ سے اس نے انتہائی ترقی حاصل کرلی اور کچھ عرصہ تک State Religion (مذہب حکومت) بنا رہا دولت عباسیہ کا دوسرا زمانہ ہوا منصور، اگرچہ خود وہ اس بات کو پسند نہ کرتا تھا کہ لوگ اُسے معتزلی سمجھیں یا اعتزال کی نسبت اسکی طرف کریں، لیکن چونکہ عمرو بن عبید (جس کا مفصل ذکر پہلے صفحات میں ہو چکا ہے) سے اس کی بچپن کی دوستی تھی اور دونوں نے مدت تک ایک ساتھ تحصیل علم کی تھی اور منصور اس کے زہد و اتقا، اور دیانت و خدا پرستی کا دل سے معترف تھا بس سلئے باوصف اس کے کہ وہ خود معتزلی نہ تھا، اسکے عہد میں اعتزال کو بہت ترقی ہوئی، واصل بن عطا نے تمام اسلامی ممالک میں اپنے نقیب بھیجے، کہ مذہب اعتزال کی منادی کریں، عبداللہ بن الحارث کو مغرب بھیجا اور بہت سے لوگوں نے اُسکے ہاتھ پر بیعت کرلی حفص بن سالم کو خراسان روانہ کیا۔ وہاں جہم بن صفوان سے جو مذہب جہمیہ کا بانی تھا مناظرہ ہوا اور جہم نے زک پائی، اس طرح ایوب کو الجزائر حسن بن زکوان کو کوفہ عثمان طویل کو آرمینیہ اور بہت سے لوگوں نے یہ مذہب قبول کرلیا،

کچھ تو اسباب اشاعت اعتزال کی یہ تھے اور کچھ یہ کہ جب منصور سلطنت و استحکام حکومت کی طرف سے فارغ و مطمئن ہو کر بیٹھا، تو اپنی توجہ علوم و فنون کی اشاعت پر مبذول کی اور پہلوی، سریانی، یونانی ہندی زبانوں سے حکمت و فلسفہ کی کتابیں ترجمہ کرائیں، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ترجمے ملک میں بہت جلد پھیل گئے۔ اور ہر گوشہ سلطنت سے اظہار پسندیدگی کیا جانے لگا، تمام ملک میں فلسفیانہ مذاق پھیل گیا، اور یہود عیسائی، پارسی قوموں کو جو حکومت کی رعایا تھیں، اسطرف بہت توجہ ہوگئی، جب مذاق فلسفہ

اس قدر بڑھ گیا، تو اسلام کے مسائل پر نکتہ چینیاں شروع ہوئیں اور منصور نے بزورِ شمشیر ان خیالات کو روکنا مناسب نہ سمجھ کر بحث و مباحثہ، تحقیق و تدقیق کی عام اجازت دے دی، غیر مذہب والوں کے مقابلہ میں محدثین و فقہا اپنی روایات و منقولات لیکر آئے۔ لیکن وہاں ان سے کیا کام چل سکتا تھا، لاچار معتزلہ کو میدان میں آنا پڑا، کیونکہ یہ مسایل مذہبیہ کو دلایل عقلی سے ثابت کرنے کے مدعی تھے، جب معتزلہ نے غیر مسلمین کے اعتراضات کو رفع کر دیا اور اسلام کے اوپر حملہ کرنے والی قومیں ساکت کر دی گئیں، تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ حمایت اسلام کے لیئے مذہب اعتزال سے زیادہ موزوں مذہب دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا، چنانچہ ملک کے تمام باشندوں کے دلوں میں اعتزال کی وقعت قایم ہو گئی، اور ہزاروں آدمی معتزلی بن گئے۔

منصور کے بعد مہدی کا زمانہ سلطنت شروع ہوا۔ اور اس نے مذہبی آزادی کو بالکل روک دیا، مہدی کا بیٹا، ہارون الرشید جب تخت نشین ہوا تو وہ بھی حکمت و فلسفہ سے نا آشنا تھا، لیکن چونکہ اس کے دربار میں خاندان برامکہ کو بہت درخور حاصل تھا اور وہ بڑے روشن خیال آزاد طبع اور علم دوست تھے اس لیئے دہر چند اعتزال نے کوئی نمایاں ترقی تو نہیں کی لیکن اسکا قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا، لیکن ہارون الرشید کے بعد جس نے مناظرہ کی مجلسیں حکماً بند کرا دیں، اور اسطرح گویا اعتزال کو سخت صدمہ پہنچایا مامون تخت نشین ہوا۔ اور اسمیں شک نہیں کہ مامون کا زمانہ اعتزال کے لئے بہترین عہد ثابت ہوا اور اس کی ترقی اوج کمال پر پہونچ گئی، یہاں تک کہ خود مامون نے علانیہ اس مذہب کو اختیار کیا اور تمام اکابر علمائے اعتزال سے دربار بھر گیا، ابو الہذیل علاف اور نظام، مامون الرشید کے

اُستاد تھے، اور مامون اُن کا بہت ادب کرتا تہا۔ اب چونکہ ابو الہذیل و نظام کا ذکر آگیا ہے اسلیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ مختصراً اُن کا حال یہاں بیان کر دیا جائے:-

ابو الہذیل علاف ۱۳۱ھ میں پیدا ہوا، مامون کا استاد اور بصرہ کے علمائے اعتزال کا پیش رو تہا۔ علامہ احمد بن یحییٰ مرتضیٰ زیدی نے اُس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے،

"وکان نسیج وحدہ وعالم دھرہ ولم یتقدمہ احد من الموافقین لہ ولا من المخالفین" ابو الہذیل اپنے عہد کا بے مثل عالم تہا، اور اُس کے موافق و مخالف علماء میں کوئی اُس کا ہمسر نہ تہا، شروع ہی سے اُسکی طبیعت فلسفہ و علم کلام کی طرف راغب تھی، علم کلام اُس نے عثمان طویل سے حاصل کیا جو واصل بن عطا کا نامور شاگرد تہا اور فلسفہ کی دقیق و مشکل کتابیں اپنے مطالعہ سے حل کیں، ابو الہذیل کا ابھی عالم شباب ہی تھا کہ ایک یہودی عالم بصرہ میں آیا اور بڑے بڑے متکلمین کو مباحثہ میں عاجز کر دیا، ابو الہذیل نے یہ سُنکر اپنے چچا سے درخواست کی کہ "مجھے بھی اسکے پاس لے چلیے"، چچا نے کہا "کہ بڑے بڑے علمائے کلام کو اُس نے مباحثہ میں بند کر دیا ہے، تم اُس سے کیونکر عہدہ برآ ہوسکوگے"، مگر وہ نہیں مانا، اور آخر کار اُس کا چچا اپنے ساتھ لے گیا، جس وقت یہ دونوں پہونچے حضرت موسیٰؑ کے مسئلہ نبوت پر بحث ہو رہی تھی، اور اُس یہودی نے سب کو اپنی زور تقریر سے خاموش کر دیا تھا۔

ابو الہذیل نے وہاں پہونچتے ہی اُس سے کہا کہ "آپ پہلے سوال کرنا مناسب سمجھتے ہیں، یا مجھے پہلے سوال کرنے کی اجازت دینگے"، یہودی نے

جواب دیا کہ "پہلے میں سوال کروں گا،" ابوالہذیل نے کہا کہ "اچھا دہ سوال کیا ہے،" یہودی نے پوچھا کہ "تم موسیٰ کی صداقت نبوت کو تسلیم کرتے ہو یا نہیں" ؟ ابوالہذیل: "موسیٰ جن کی نسبت آپ پوچھتے ہیں اگر وہی نبی ہیں جنھوں نے ہمارے نبی کی بشارت دی اور ان کی رسالت کی تصدیق کی تو بیشک وہ سچے نبی ہیں اور اگر کوئی اور موسیٰ مراد ہے تو میں تسلیم نہیں کرتا۔"

یہودی نے بھر اٹھا کر دوسرا سوال کیا کہ "توراۃ کو تم سچی کتاب مانتے ہو یا نہیں" ابوالہذیل نے اسکا بھی جواب ویسا ہی دیا کہ اگر توراۃ سے مراد آپ کی وہی توراۃ ہے جس میں ہمارے نبی کی بشارت موجود ہے تو بے شک ہم اسے خدا کی کتاب مانتے ہیں اور اگر کوئی اور توراۃ ہے تو ہم تسلیم نہیں کرتے ۔

ابوالہذیل جب تحصیل فلسفہ وکلام سے فارغ ہوگیا تو اُس نے مخالفین اسلام سے مناظرہ و مباحثہ شروع کیا اور ایسی سرگرمی کے ساتھ اسمیں مصروف ہوا کہ بہت تھوڑے زمانہ میں سارا ملک اُس کی فصاحت و خوش بیانی، کمالات علمی و فن مناظرہ کی خوبی کا قایل ہوگیا۔

ابوالعباس اکثر کہا کرتے تھے کہ میں نے ابوالہذیل و جاحظ سے زیادہ فصیح انسان کسی کو نہیں دیکھا، یزدان بخت، رئیس مانویہ اور ہشام بن حکم سے جو فرقہ مجسمہ کا سرگروہ تہا، اس نے مباحثے کیے، اور مجوس وثنویہ فرقوں کے علماء کے ساتھ بھی بڑے بڑے معرکۃ الآرا مناظرے کئے، اور سب میں کامیاب رہا۔ اُسکی خصوصیت استدلال یہ تھی کہ ہمیشہ معترض کو نہایت مختصر جواب سے بند کر دیا کرتا تہا، اور اُس کی قوت بیانی کا اثر تھا کہ تین ہزار سے زاید غیر مذہب کے لوگ مسلمان ہوگئے ۔

ایک دفعہ دوران گفتگو میں ابو الہذیل نے ایک فلسفی عالم سے، جو اعراض سے وجود مستقل کا منکر تھا، کہا خدا نے فرمایا ہے "الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منہما مائۃ جلدۃ" یعنی ... واسے مرد و عورت دونوں میں سے ہر ایک کو سو تازیانوں کی سزا دو اور دوسری جگہ فرماتا ہے کہ "والذین یرمون المحصنٰت ثم لم یاتوا باربعۃ شھداء فاجلدوھم ثمانین جلدۃ" یعنی جو لوگ پاکدامنوں پر تہمت لگاتے ہیں، اور چار گواہ پیش نہیں کر سکتے اُن کے ... کوڑے ...

آیتوں میں زانی کی حد زیادہ ہے یا قاذف ...

فلسفی "زانی کی حد زیادہ ہے" ابو الہذیل "کیا ...

میں سے ... ابو الہذیل "کیا لفظ جلد ...

"نہیں" ابو الہذیل "کیا اس سے کوڑا ...

"کیا اس سے مجرم کی پشت مراد ...

سے وہ فاصلہ مراد ہے جو کوڑے ...

"نہیں" ابو الہذیل "تو کیا ... نزدیک ایک

کے زیادہ ہو سکتی ہے"

ایک بار مجلس مناظرہ میں اس نے ایک مجوسی ...

نزدیک آگ کی حقیقت کیا ہے؟ مجوسی "آگ ...

"اور گائے کیا مرتبہ رکھتی ہے" مجوسی "گا ...

جن کے بازو کٹ گئے ہیں" ابو الہذیل "پانی کیا ہے ...

نور" ابو الہذیل "بھوک اور پیاس کیا ہیں؟" مجوسی "... طا ...

ابو الہذیل "زمین کو کون اٹھائے ہوئے ہے ...

...زیل" تو دنیا میں مجوسی سے زیادہ کون برا ہو سکتا ہے؛ جنہوں نے
... کے فرشتوں کو پکڑ کر ذبح کیا۔ پھر خدا کے فرشتے دھویا اور خدا کی
... پر رکھ کر بھونا پھر اسے شیطان کے فقر و فاقہ کے سپرد کیا اور اسکو
... فرشتہ کے سر سے جو خدا کے فرشتوں میں سب سے زیادہ معزز ہے
اٹھایا اور اسکی کھال کھینچ لی"۔

ایک بار حسن بن سہل کی مجلس میں جا نکلا، ایک مجوسی امیر کی مسند کے
پاس بیٹھا ہوا۔ ابوالہذیل نے پوچھا یہ کون جوان ہے جسکو امیر نے اس
قدر ... بخشی، امیر نے کہا کہ یہ مجوسی ہے"، ابوالہذیل" مجوسی ... حساب ...
... کے احکام"، امیر" یہ نجوم کے احکام جانتا ہے"، ابوالہذیل
... اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ اس سے پوچھوں"
... کیجئے ... ابوالہذیل نے ایک سیب ... سے
... کہا ... بتائیں میں اس سیب کو ...
... آپ ... اسکو ضرور ... گے"، ابوالہذیل
... اسکو ہرگز ہرگز نہ کھاؤنگا، مجوسی
... آپ سیب کو ... میں ... پھر غور کرتا
... ابوالہذیل نے ... دوسرا سیب ہاتھ ...
... دوسرا سیب کیوں اٹھایا، ابوالہذیل" اسلئے کہ
... نہیں کھاؤ گے تو میں اس سیب کو ضرور کھا جاؤں گا"۔
... مجلس سے اٹھ گیا۔

... بصرہ میں ایک نووارد شخص اسکے پاس آیا اور کہا کہ مجھے قرآن
... میں نے بہت کوشش کی کہ وہ رفع ہو جائیں۔

لیکن کسی طرح تشفی نہ ہو سکی جب مجھے چند احباب نے مشورہ دیا کہ آپ کے پاس جاؤں، اسلیئے آپ خدا کے لیئے میری تشفی کر دیجئے، ابوالہذیل "میں سنوں کہ وہ شبہات کیا ہیں" نووارد "قرآن کی چند آیتوں میں مجھے تناقض معلوم ہوتا ہے، اور چند آیتیں ایسی ہیں جن میں زبان کی غلطی معلوم ہوتی ہے"

ابوالہذیل "آپ ایک ایک آیت پر الگ الگ اپنے شبہات بیان کرنا چاہتے ہیں یا اپنے تمام شکوک کا جواب ایک ہی دفعہ سُننا پسند کرتے ہیں" نووارد "اگر ایک ہی دفعہ تمام شبہات کا جواب دینا ممکن ہے تو یہ اور بھی مناسب ہے"

ابوالہذیل "آپ کو معلوم ہے کہ محمد صلعم عرب کے شرفا میں سے تھے، اور اُن کی زبان مستند اور غیر مطعون تھی، اور وہ اپنی قوم کے نزدیک سب سے زیادہ عاقل تھے" نووارد "بیشک وہ ایسے ہی تھے" ابوالہذیل "آپ کو معلوم ہے کہ عرب کے لوگ نہایت تند خو، سرکش اور جھگڑالو تھے" نووارد "یہ بھی سچ ہے" ابوالہذیل "آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اہل عرب نے ہمارے پیغمبر کی تکذیب و مخالفت میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہیں اٹھا رکھا" نووارد "بے شک یہ بھی صحیح ہے" ابوالہذیل "آپ جانتے ہیں کہ انھوں نے تناقض کلام یا غلط گوئی کا الزام ہمارے پیغمبر پر نہیں لگایا" نووارد "کبھی نہیں" ابوالہذیل "تو اعراب کی شہادت چھوڑ کر جو اپنی زبان سے خوب ماہر تھے آپ کسی جاہل کی بات کا کیوں اعتبار کرتے ہیں" نووارد یہ سُنکر مسلمان ہوگیا *

ابوالہذیل کو عربی اشعار کثرت سے یاد تھے، اور اکثر اپنے کلام میں اُن سے استناد کرتا تھا ابو معن ثمامہ کہتے ہیں کہ ابوالہذیل جب مامون کے

دربار میں مجھ سے خطاب کرتا تو ہمیشہ میرا نام لیکر مجھ سے بات کرتا، اور مامون ہمیشہ کنیت کے ساتھ یاد کرتا۔ مجھ کو کئی دفعہ اسپر غصہ آیا لیکن آداب مجلس کا خیال کر کے خاموش ہو ہو جاتا تھا، ایک بار ابوالہذیل نے مجلس مناظرہ میں اپنے کلام کی سند میں سات سَو اشعار پڑھے، یہ دیکھ کر میں دنگ ہو گیا، اور میں نے کہا کہ اب آپ کو اختیار ہے میرا نام لیکر مجھ سے بات کیجئے یا میری کنیت کے ساتھ خطاب کرے''

ایک دفعہ ابوالہذیل، صالح بن عبدالقدوس سے ملنے گیا جو ثنوی المذہب تھا، اسی زمانہ میں صالح کا جوان لڑکا مر چکا تھا۔ صالح کو رنجیدہ دیکھ کر ابوالہذیل نے کہا کہ ''آپ تو انسان کو کھیتی کی طرح سمجھتے ہیں جو پھلتی پھولتی اور اپنے وقت پر کٹ جاتی ہیں پھر آپ کیوں غمگین ہیں'' صالح ''نہیں مجھے افسوس صرف اس وجہ سے ہے کہ اس نے کتاب الشکوک نہیں پڑھی تھی'' ابوالہذیل ''وہ کیا کتاب ہے'' صالح ''کتاب الشکوک میری ہی تصنیف ہے اور جو اسکو پڑھتا ہے موجودات میں شک کرنے لگتا ہے کہ شاید وہ نہیں ہیں اور معدوم اشیاء کی نسبت شک کرنے لگتا ہے کہ شاید وہ ہیں'' ابوالہذیل ''تو آپ اپنے بیٹے کی نسبت شک کریں اور یہی خیال کریں کہ وہ مرا نہیں ہے، اور اسی طرح آپ شک کریں کہ مرحوم نے کتاب الشکوک پڑھی ہے، حالانکہ اس نے نہیں پڑھی ✦

ابوالہذیل سے ایک عالم نے اثنائے گفتگو میں کہا کہ آپ عالم کا حادث ہونا ثابت کریں مگر بغیر اس کے کہ اس میں پہلے حرکت وسکون کا موجود ہونا تسلیم کیا جائے ابوالہذیل نے کہا ''سبحان اللہ آپ کی مثال تو بالکل اُس شخص کی سی ہے جو اپنے مخالف سے کہے کہ آؤ میرے ساتھ قاضی کے پاس چلو، لیکن دیکھو اپنے دعوے پر کوئی دلیل پیش کرنا''

اشخاص ثلاثہ

یورپ میں جب سے جنگ و جدل قتل و قتال کا بازار گرم ہوا ہے "اتحاد ثلاثہ" اور "ائتلاف ثلاثہ"، مرکب الفاظ نے ایک عجیب قسم کی دلچسپی پیدا کر رکھی ہے۔ دنیا بھر کے "اخبارات" "رسالہ جات" میں "اتحاد ثلاثہ" اور "ائتلاف ثلاثہ" کے مختلف پہلوؤں پر بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ ہم سے بھی چند احباب متقاضی ہیں کہ ہم بھی "اتحاد ثلاثہ اور ائتلاف ثلاثہ" پر کچھ اپنے خیالات ظاہر کریں اور اگر "اتحاد ثلاثہ" "ائتلاف ثلاثہ" پر اظہار خیالات خلاف احتیاط سمجھیں تو کسی اور "ثلاثہ" پر کوئی مضمون لکھیں۔ ہمیں فرمائش احباب کی تعمیل میں تو کچھ عذر نہیں ہے۔ لیکن فی زمانہ مشکل ایک بہت بڑی یہہ پیدا ہو گئی کہ اگر ہم کسی **سیاسی**!! مسئلہ پر کوئی مضمون لکھتے ہیں تو اس زمانہ کی نزاکت ہمیں اسکی اجازت نہیں دیتی اور اگر!! کسی **اخلاقی** سبجکٹ پر قلم اٹھاتے ہیں رفتار زمانہ سے اسکی مساعدت کی بھی توقع نہیں ہوتی کیونکہ بعض طبیعتیں آجکل "**اخلاق**" "**وسیاست**" جیسے متفرق و متبائن الفاظ و خیالات کو بھی مترادف سمجھنے لگ گئیں ہیں بس قسم کی غریب کی وجہ سے یہہ زمانہ انڈیا بھر میں اس قسم کی مضامین نویسی کے واسطے خطرہ سے پاک نہیں ہے کیسی ہی طبیعت کی صفائی اور پاک بازی سے کوئی پولیٹکل یا **سیاسی** یا **اخلاقی** مضمون لکھا جائے ممکن نہیں کہ دوست دشمن کی نشانہ بازی کا شکار نہ ہونا پڑے۔ ایسے زمانہ میں مضمون نگاری کے واسطے حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے جب تک "حکومت" اور اہل ملک کی طرف سے

پوری آزادی میسر نہ ہو کسی سمجھدار شخص کا کام نہیں ہے کہ وہ **پولیٹیکل اکانمی** بیان کرے یا امور **سیاست** کی گتھیاں سلجھانیکی کوشش کرے یا **اخلاق** اور فلسفہ **اخلاق** پر کوئی کچھ دے۔

خصوصاً مجھ جیسے کمزور طبیعت والے شخص کے لئے یہہ ہی اک مجبوری کیا کچھ کم ہے کہ زمانہ میں انقلاب عظیم پیدا ہو رہا ہے جو دوست تھے اونمیں دشمنی پیدا ہو رہی ہے اور جو دشمن تھے اونمیں دوستی اور اتفاق کا جوش سمندر موجزن ہو رہا ہے۔ ایسے نازک وقت میں ہمارے احباب کی فرمایش نے اک خلجان میں ڈال دیا ہے۔ سوچتا ہوں کہ کیا کروں کوئی مضمون لکھوں اور لکھوں تو کیا لکھوں۔

حالت دل مضطر لکھوں چھوٹا سا اک مضمون لکھوں
افسانۂ لیلیٰ لکھوں یا قصۂ مجنوں لکھوں

سب سے پہلے چاہتا ہوں کہ **مشاہیر ثلاثہ** جو اک تاریخی ناتمام مضمون جو رسالہ ید بیضا میں شائع ہوا تھا اُسے پُورا کر ڈالوں مگر اوس زمانہ کا سا نہ طبیعت کا، جوش و خروش ہے نہ دل میں وہ اگلی سی امنگ باقی ہے لہذا یہہ ارادہ بھی نقش بر آب ثابت ہوتا ہے۔ پھر چاہتا ہوں کہ کسی یگانۂ روزگار شخص کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرکے کچھ فکر سخن ہی کروں اور اک ایسی ....

غزل لکھوں

اوستاد کو میدان میں آج ہمنے پچھاڑا چھاتی پہ چڑھے کو دکے ڈاڑھی کو اکھاڑا
اوستاد کے مصرعہ پہ لگاتے ہیں گرہ ہم شاعر ہمیں کردیجئے یا پیر بخارا
یہہ طرفہ غزل ہمنے کہی مولوی صاحب اصلاح سے دل کیجئے خورسند ہمارا

پہلی ہی غزل پر ہیں ہُوا داد کا خواہاں   شاہا چہ عجب گر بنوازند گدا را

مگر جب یہہ خیال دامنگیر ہوتا ہے کہ ۱۸۸۸ء کا زمانہ اب کہاں کہ ظریفانہ چاشنی کی قدر و منزلت ہوتی ہے ایک طرف لکھنؤ میں منشی سجاد حسین صاحب اخبار **اودھ پنچ** کے کالموں میں لطائف و ظرائف کے مضامین کا انبار لگاتے رہتے تھے اور دوسری طرف **میرٹھ** میں سید مرتضیٰ حسین صاحب **بیان** یزدانی اخبار **طوطی ہند** میں پسندِ خاطر احباب کے لئے سامانِ عجیب کی فراہمی میں شب و روز ہمہ تن مصروف نظر آتے تھے۔ اصل یہہ ہے کہ خیال آرائی"... یا "مضمون نگاری" کا "شوق" یا بالفاظ دیگر "خبط"، جو کچھ بھی کہیے اچھا خاصا مالیخولیا کا مرض ہے خیال پیدا ہوتے ہی اک اُدھیڑ بن بھی شروع ہو جاتی ہے اب مجھے بھی یہ اتفاق پیش آیا ہے کہ کئی شب و روز ہو گئے با وجود "غور" و "خوض"، "تلاش" و "جستجو" سے کوئی اچھا عنوان مضمون نویسی کے واسطے نہ ملا۔

"اُلجھن" "کشمکش" اور "مخمصات" کے ہجوم نے مبہوت سا بنا رکھا ہے خواہشات کا سلسلہ طول ہوتا گیا مگر کوئی موزوں عنوان ذہن نشین نہ ہوا مسلسل یا متواتر خواہشات کے طومار نے گھیر لیا اور پھر ہر ایک مشکل اور دشوار تر بقول شخصے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے   بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہہ غزل ملا دوپیازہ کے اک شاگرد نے لکھی تھی جسپر اُنہوں نے یہہ اصلاحی شعر لکھا تھا ؎

یہ طرفہ غزل ہوئے ہیں دست کرے آگے   صد لعنت و پھٹکار منیں فہن رسارا

قصہ مختصر یہہ کہ کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی اور میں حضرت لسان الغیب

حافظ شیرازی علیہ الرحمتہ کی طرف رجوع ہوا۔ دیوان نکالکر دیکھا تو اس شعر پر نظر پڑی۔

آسائشِ دو گیتی تفسیر این دو حرف است　　با دوستان تلطف با دشمنان مدارا

تھوڑی دیر تک میں اس شعر کے معنی اور مطالب پر غور کرتا رہا پھر طبیعت کی خواہش پر آہستہ آہستہ گنگناتا رہا اور یکایک "حسرت"، "نیاز"، دیگر اشخاص ثلاثہ کی وقعت اور عظمت نے دل میں گھر کر لیا اور تقاضائے طبیعت ہوا کہ ان "اشخاص ثلاثہ" پر ہی قلم فرسائی کرنی چاہیئے +

تجویز عنوان کی گتھی سلجھی تھی کہ مولوی فضل الحسن صاحب حسرت موہانی بی اے کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگی۔ آپ مشہور رسالہ "اردوئے معلی" کے ایڈیٹر اور علیگڈھ کالج کے ممتاز تعلیم یافتوں میں سے ہیں۔ نثر و نظم دونوں خوب لکھتے ہیں علیگڈھ کے بی اے کلاس کا کوئی طالب علم شاعر نہیں کہلایا جاتا بجز حسرت کے اردو شاعری میں فی زمانہ جو نازک خیالی "لطافت"، "سادگی"، آپ کے کلام میں پائی جاتی ہے وہ میر و مرزا کے کلام کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ آپکی زبان اس درجہ "شستہ"، اور "پاکیزہ"، ہے کہ اگر مولانا آزاد مرحوم کا تذکرہ آب حیات کہلایا جا سکتا ہے تو مولوی حسرت کا کلام نظم اور عبارت نثر آب مقطر کہلائے جانے کی ضرور مستحق ہے۔

اردوئے معلیٰ میں اک مرتبہ نزاکت پاکیزگی اور صفائی بیان کے سلسلہ میں مولانا حالی مرحوم مغفور اور ڈاکٹر اقبال کی شاعری میں چند اعتراض ہوئے تھے اور اک دلچسپ بحث درستی زبان کے متعلق شروع ہوئی تھی مگر افسوس اوسکا سلسلہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا اور

یہہ لٹریری قابل قدر خدمت پیدا ہوکر ناپید ہوگئی - اوراب امید نہیں کہ کسیکو اس کا حوصلہ ہو اردوے معلے اک **بےنظیر** ادبی رسالہ تہا اگر صرف علم ادب ہی کی ترقی سے متعلق اوسمیں ہنرمندی اور سلیقہ شعاری کے ساتھ کام کیا جاتا تو یقیناً ضروریات ملک کی اک بہترین خدمت انجام ہوتی رہتی مگر بدقسمتی سے اوس میں **سیاسی** مضامین بہی شامل کردیے گئے - **ادب** و **شاعری** کے ساتھ **پولٹیکل** اور **سیاسی** بلند پرداری اک بے جوڑ بات تہی اگر "پولٹیکل" اور "سیاسی" مضامین کی اشاعت ضروری ہی خیال کی گئی تہی تو اِس ضرورت کے واسطے علحدہ اک رسالہ ہونا چاہیے تہا جس میں باحتیاط تمام سنجیدہ اور پُرمغز پولٹیکل مضامین کی متانہ روی کے ساتھ اشاعت کی جاتی تو ضرور مُفید نتیجہ پیدا ہوتا اور رسالہ ہرقسم کے نقصان سے بہی محفوظ رہتا۔ مگر افسوس کہ مولانا حسرت پر کانگرسی رنگ زیادہ غالب ہوگیا اور اُنھوں نے اردوے معلے میں ادب و شاعری کے پہلو کو ضعیف کرکے "پولٹیکل" اور "سیاسی" مضامین کی چاشنی کو غالب کردیا جس کی وجہ سے خود اونکو بعض تکالیف کا سامنا ہوا اور اہل نظر کے نزدیک رسالہ بہی بے لطف سا ہوگیا۔ اسی غلطی کی وجہ سے اُردوے معلے گمنامی کے پردہ میں رُوپوش ہوکر گویا زبانِ حال سے کہہ رہا ہے:-

عنقا کی طرح گم ہو جو شہرت پسند ہے   پایا اُسی نے نام کہ جو بے نشاں رہا

اور مولانا حسرت بہی گلہ مند نظر آتے ہیں جیسا کہ اونکے تازہ کلام سے مترشح ہوتا ہے

کلام حسرت

مرمٹیں گے جو غم ہجر کی ایذا ہے یہی   اک نہ اک روز ترے عشق میں ہونا ہے یہی

آج اغیار میں جو یار تھے کل تک کیا خوب　　　آپ کے اس انصاف پہ دھبّا ہے یہی
ناگوارا ہے بہت تلخیٔ ہجران لیکن　　　تم جو کہتے ہو گوارا تو گوارا ہے یہی
یا ہماری ہی یہ قسمت ہے کہ محروم ہیں ہم　　　یا مگر اونکی محبت کا نتیجہ ہے یہی
یہ جو اک دردِ محبت کی خلش ہے حسرتؔ　　　مقصدِ دل ہے یہی جانِ تمنا ہے یہی

ہمیں مولانا حسرت کی خداداد قابلیت کا اعتراف ہے مگر ونکی "دہ پالیسی" سے اختلاف ہے ہم تو یہ چاہتے ہیں۔

یار کا پاس نزاکت دل ناشاد رہے
نامہ لکھتا ہُوا تھمتی ہوئی فریاد رہے

مولانا ئے موصوف کی اک غزل حال میں شائع ہوئی ہے جسے ہم خلش خار سے موسُوم کر کے یہاں لکھتے ہیں ناظرین خیال فرمائیں کہ حسرت کے دل سوختہ میں کیسی کیسی دلدوز آہیں پوشیدہ ہیں۔ .. ..

زیرِ دیوار ذرا جھانک کے تم دیکھ تو لو　　　ناتواں کرتے ہیں دل تھام کر آہیں کیونکر

خلشِ خار

ہم سحر ہو سرِ کے حق کا سرانجام کہاں　　　دیکھیں اس صبح صداقت کی اب ہو شام کہاں
عشق میں صبر و سکوں اے دلِ ناکام کہاں　　　اس دلارام کی خواہش ہے تو آرام کہاں
خاص تعزیر کے لایق ہے گنہگاریٔ عشق　　　درخورِ جاں ہے تری سرزنشِ عام کہاں
پندِ ناصح وہ سنے خوفِ ملامت ہو جسے　　　پاسِ ناموس کہاں عاشقِ بدنام کہاں
ترکِ آداب کا عشاق سے بیجا ہے گلہ　　　جب نہ ہو موردِ الزام تو الزام کہاں
کشورِ ہند کہ مغلوب رہا ہے اسمیں　　　نام ہی نام ہے اسلام کا اب نام کہاں

حسرتِ زار ہے اور کشمکشِ یاس و اُمید
اب وہ بالیدگیٔ شوق کا ہنگام کہاں

نیاز

ابوالمعانی جناب نیاز محمد خاں صاحب "نیاز" فتحپوری شاعری کے اسٹیج پر
جب کبھی تشریف لاتے ہیں اور شاعرانہ کوئی پارٹ کرتے دکھاتے ہیں
تو ونس مور کا اک شور مچ جاتا ہے۔ آپ کے فیض کرم سے ہندوستان
کے ممتاز اور قابل قدر رسالہ "ادیب" اور "پنجاب ریویو" سیراب
ہو چکے ہیں اور اب موقت الشیوع پرچے بھی مستفیض ہو رہے ہیں آپ کے
کلام میں وہ "درد" اور "اثر" ہے کہ داغ اور حالی جیسے سحر بیان اشخاص
کی یاد تازہ رہنے کی کچھ امید ہے تو ایسی ہی شخص سے ہے جیسے حضرت نیاز
ہیں۔ زمانہ حال میں جناب نیاز کے تازہ "افکار" میں "ہذیان" "محبت" اک ایسی
نفیس نظم شایع ہوئی ہے کہ داد دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ ع
اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ

ہذیانِ محبت

پھر سے مجھے طوق و سلاسل کا خیال آنیلگا
پھر مجھے مرغ حرم نو رہ کے تڑپا نیلگا

پھر نمایاں ہو چلا دامن مرے ملبوس کا
یعنی اشکوں میں مرے پھر رنگ خوں آنیلگا

سینۂ عریاں پہ چوٹیں پھر ابھرنے لگیں
پھر گریباں ہلکے مرا دستِ جنوں جانیلگا

پھر وہی ہے ناخن غم اور وہی کاوشیں
پھر مجھے درد نہاں کچھ آج تڑپا نیلگا

پھر بہار آئی چمن میں زخم دل آئے ہوئے
پھر مرے داغ جنوں آتش کے پرکالے ہوئے

عقل کہتی ہے کسی کی پردہ داری چاہئے
دل یہہ کہتا ہے نمود بیقراری چاہئے

کسکو سمجھاؤں کہ تجدید وفا اک جرم ہے
اس میں پہلے عہد کی نا استواری چاہئے

مصلحت غمازی زا ہو زخم دل ظاہر نہو
میں یہہ کہتا ہی نہیں خونناب باری چاہئے

ہے سکون اک طوکا خاموشی زندان میں بھی — مجھکو لیکن خیصتِ فریاد وزاری چاہیے
بھی ہزا بھر بیٹھے بیٹھے آج گھبرانے لگا — یعنی دیواروں سے پھر یہاں سرکو ٹکرانا چاہئیگا

حضرت دلگیر

سید نظام الدین شاہ صاحب دلگیر اکبرابادی کچھ عرصہ سے آگرہ یا اکبرآباد عہد اسلامی سے اردو کی ترویج کی یادگار رہے اردو کی ترقی اور نشو و نما میں بھی حصہ دار رہے کیونکہ میر و غالب جیسے مواد ہونے کا فخر اسکو حاصل ہے۔ اردو رسائل کی کساد بازاری کی حالت میں خیال ہوتا تھا کہ آگرہ سے بھی اردو زبان خدمت کا کچھ سلسلہ شروع ہو تو مناسب ہے۔ مسرت کا مقام ہے کہ حضرت دلگیر کے مذاقِ طبیعت نے اور ان کے نقاد ا جیسے عمدہ درجہ کی رسالہ کی ماہانہ اردو رسالوں میں ایک مفید اضافہ کرا دیا دلگیر خود ایک خوش فکر اور سخن ور اور سخن شناس شخص ہیں اور اون کے احباب کا حلقہ بھی اچھا خاصا وسیع ہے جو ناظم بھی ہیں اور نثار بھی ہیں یہی وجہ ہے اس کے مضامین اچھے ہوتے ہیں اب تھوڑے عرصہ سے اس میں تصاویر کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا گیا ہے بہرحال اب یہہ پرچہ ”ادیب“ اور ”مخزن“ کا قائم مقام خیال کیا جاتا ہے۔ قریب زمانہ میں مولنا الطاف حسین صاحب **حالی** مرحوم مغفور کی تاریخ وفات دلگیر کے قلم سے جو نکلی ہے بلحاظ سوز و گداز اپنا نظیر نہیں رکھتی دل چاہتا تھا کہ حالی کی وفات پر دو آنسو بہانے کو کچھ ”آہ و بکا“ سامان چاہیے ہم ممنون ہیں کہ اون کی آہ شرر بار نے ہمارے دلِ سوختہ سے بھی چار آنسوؤں کا خراج وصول کر لیا +

سے فردوس دماغ بنا میری خوش رنگی سے جنت نگاہ بنا لیکن مجھے ٹہنی سے جدا کر۔

او ظالم! میری شکائتیں بیشمار ہیں۔ کاش میری فریاد سننے والا کوئی ہوتا تو دردِ دل سناتا اور انصاف پاتا۔ تاہم تجھے ہی سُناتا ہوں تاکہ شاید تیرا سنگین دل نرم ہو۔ ممکن ہے کہ تو اپنی زبردستی سے باز آجائے۔ آخر میری زندگی نہایت مختصر ہے عمر طبعی چند گھنٹے ہے۔ کاش تو مجھے چند گھنٹے جینے دے۔ اب میری فریاد سُن۔

۱۔ جب تجھے کسی دیوتا۔ پیر۔ فقیر۔ مرقد سے التجا کرنی ہوتی ہے اور انکی خوشنودیٔ مزاج مطلوب ہوتی ہے۔ مجھ غریب کی جان پر بن آتی ہے۔ میں چڑھاوے کا کام دیتا ہوں۔

۲۔ جب تجھے وارفتگان کی تربت پر جانے کا موقع ہوتا ہے مجھ بیکس کو مردوں کے سینے پر چھوڑ آتا ہے میری ہی وہیں ہوائی تربت بنجاتی ہے۔

۳۔ جب تجھے کسی اپنے سے بزرگ بنی نوع انسان کی تکریم و تحسین منظور ہوتی ہے مجھ پر آفت آنے لگتی ہے۔ میرا ہی دل جانتا ہے جس طرح سے میرے سینے میں سوئیاں چبھو چبھو کر ہار بنائے جاتے ہیں۔ اور ظالمانِ درجۂ اولیٰ کے زیبِ گلو ہوتے ہیں۔

۴۔ جب آدمی زاد بیاہ شادی کرتے ہیں تو بارانِ گلاب و بارش گل شروع ہوجاتی ہے اور مجھ کس مپرس کی شامت آتی ہے۔ کہیں سہرے پر لٹک رہا ہوں کہیں گجرے میں جکڑا ہوا ہوں کہیں سیج میں پائمال ہو رہا ہوں۔

۵۔ واہ رے تیری آسائش پسندی! تجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ تو میرے پاس آکر میرے حسن و جمال سے حظ حاصل کرے۔ نہیں مجھے ٹہنی سے توڑ گلدستہ بنا گول کمروں اور کھانے کے کمروں میں رکھ دیتا ہے جہاں مجھے مرگِ مفاجات جلد آجاتی ہے۔ تیری خود غرضی یہاں تک ہے کہ دستنبو بنا کر مجھے بٹن ہول میں لگا کر مجھ نیم مردہ کو سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ واہ رے تیری فرطِ محبت!

۶۔ تو کن کن غیر جنسوں کے ساتھ مجھے ہم آغوش کرتا ہے کبھی تلون میں مجھے ہم خواب کرتا ہے کبھی سرسوں سے میری صحبت ہوتی ہے۔ تاکہ میرے جوہر ان میں منتقل ہوں۔ میری روح اُن کے جسم میں داخل ہو۔ اور بقول تیرے "دہ دبس" جائیں اور میں خانہ برباد ہو جاؤں۔

۷۔ کبھی تو مجھے روغنوں میں حل کرتا ہے۔ میرا رنگ زائل کر دیتا ہے بلبل کی بد دعائیں تجھ پر اثر نہیں کرتیں۔ میری روح تن سے جدا کر کے مجھے روغن میں مقید کر دیتا ہے۔ اس فرط الفت کا نام تو نے عطر رکھ چھوڑا ہے

۸۔ کبھی تیری سنگدلی اس درجہ تک پہنچتی ہے کہ مجھے قرع انبیق میں ڈال آتش سوزاں پر رکھ کر جوش دیتا ہے۔ اس پر بھی صبر نہیں۔ پھر دو آتشہ کرتا ہے۔ اس پیار کے اظہار کا نام عرق ہے۔ او ظالم! تیری جبین پر کاش عرق انفعال آتا۔ مگر کہاں۔

۹۔ او ظالم! تو مجھے میری موت کے بعد بھی نہیں چھوڑتا۔ تجھے یقین نہیں آتا کہ میں کما حقہ مرا ہوں۔ میری پتیاں سکھاتا ہے۔ پھر مجھے نسخوں اور معجونوں میں ڈالتا ہے اور اُن معدوں کی امداد کرتا ہے جن میں تیرے خنجر نے اور وں کی روح ہلاک کر کے داخل کئے ہوئے ہیں۔

۱۰۔ او بے رحم آدمی زاد۔ تو تو انسان ہی کہلانے کا مستحق نہیں! اشرف المخلوق تو تیری لغات میں نہ ہونا چاہئے۔ حق تو یہ ہے کہ تیرا کیا قصور ہے۔ یہ معمّا کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں کسی اذیت میں دوسرے کا عیش ہو۔ اور مجھے تو ذوق کا یہ شعر پڑھنا کافی ہے۔

اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

غزلیں

ضبط گریہ اس بت کے تار اشک غم ٹوٹے نہیں
دم میں دم جبتک ہے دامان وفا چھوٹے نہیں

عہد پر نادم ہیں گو آپ کیونکر بات لوں
کیا یہ پیمان وفا میرا ہے جو ٹوٹے نہیں

دل تو سننے کے لئے تیار تھے گو ان کا دل
کیا غضب اس کا کہ ہم ہی منہ سے کچھ پھوٹے نہیں

یاد رکھنا ایک دن پیری تو پھر پچھتاؤ گے
گر جوانی میں جوانی کے مزے لوٹے نہیں

زندگی جبتک ہے یا رب عیش دنیا کم نہ ہو
جام ہے منہ سے صراحی ہاتھ سے چھوٹے نہیں

نوچ ڈالے بلبل بے خانماں کے بال و پر
یا الٰہی ہاتھ کیوں صیاد کے ٹوٹے نہیں

رات دن اس فکر میں رہتا ہے فصیح باوفا
رشتہ الفت جہانتک ہو سکے ٹوٹے نہیں

[illegible]

چشم بد دور ایسے ہو تم دل میں
پیار کرے کوئی نہ محفل میں

درد ہو داغ ہو غرض کچھ ہو
اک تری آرزو نہ ہو دل میں

بیٹھتے جی سے غبار ناکامی
ہو گئے دفن کوئے قاتل میں

تم نے ترکش میں ان کو رکھا تھا
ہم نے تیروں کو دی جگہ دل میں

مے سے کر کے وضو تو چل زاہد
ممبر سے پیر مغاں کی محفل میں

بسملوں کی دعا ہے اے حد بڑھے
باڑھ خنجر میں نوک قاتل میں

انتہا ہے یہ سوز الفت کی
خون کے بدلے آگ ہے دل میں

کیا بگڑتا ہے کیوں مساعی ہو
دور بیٹھے رہیں گے محفل میں

تم نہا کر چلے جو دریا سے
اشک بھر آئے چشم ساحل میں

تم جگر صاف کر گزرتے ہو
ٹھان لیتے ہو بات جو دل میں

[illegible]

مبارک ہو

اُمہاتُ الاُمّہ

مؤلفہ مولانا مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم مغفور جو بعض کوتاہ بین علماء کے تعصب سے دنیا سے نابود ہو چکی تھی اور جسکی مطالعہ کا شوق لوگوں کو مضطرب کئے ہوئے تھا۔ جسکی ایک ایک جلد سو سو دو دو سو روپیہ شائقین قیمت دیکر کوتیار تھے اس کا حصہ اول طبع ہوکر غیر مسلم اقوام کو مفت تقسیم ہو رہا ہے چونکہ اسکی اشاعت کی غرض زیادہ تر یہ ہے کہ وہ غیر مسلم اقوام میں بکثرت تقسیم ہو تاکہ تعدادِ ازدواجِ رسولِ مقبول پر جو اعتراضات ہیں انکی اصلاح ہو اور اسلام کی حقانیت انکی ذہن نشین ہو اسلیے مسلمانوں سے توقع کیگئی ہے کہ وہ اسکو خرید کر اس کے حصہ دوم و ترجمہ انگریزی کیلئے مدد دیں تاکہ وہ بھی چھپکر بکثرت تقسیم ہوسکے کتاب کی عمدگی کی نسبت کچھ لکھنے پڑھنے کی ضرورت نہیں صرف مولانائے مرحوم کا نام کافی ہے کہ وہ کسی درجہ کی ہوگی حصہ دوم زیر اہتمام ہے اور ترجمہ ڈاکٹر مشرف الحق صاحب کے ہاتھوں میں اب یہ مسلمانوں کے اختیار میں ہے کہ اسکی تکمیل جسقدر چاہیں جلد ہوسکتی ہے قیمت بارہ آنہ (۱۲)

منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجیے

[illegible]

ڈاکٹر

برمن کا جوہر

پیپرمنٹ

[illegible]

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ

مئی ۱۹۱۵ء

تمدن

معاشرتی تمدنی ادبی فلسفی اخلاقی تاریخی اور علمی مضامین کا

ایڈیٹران شیخ محمد اکرام بیرسٹر ایٹ لا محمد عبد الراشد الخیری

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری قیمت فی پرچہ

[illegible] قسم دوم تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا ساڑھے چار آنہ فی نمبر

دوستو! لیجئے ہماری نئی ایجاد

اگر آپ جھوٹے اشتہاروں سے بدظن ہو کر علاج سے تنگ آ گئے ہیں تو آخر میں اب ایک بار ہماری سفارش کو قبول فرمائیں اور قدیمی کی مشہور معروف ادویہ

آتشک نگرہ گولیاں

کا استعمال فرمائیں۔ اکسیر مالک کی قدرت کا مشاہدہ کریں گے جملہ طاقتیں از سر نو عود نہ کر آئیں تو ہمارا ذمہ۔ صاحبو! اس باب میں زمانہ کے معززین اصحاب تعریف فرما رہے ہیں لاکھوں کی تعداد میں سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔ مردوں اور عورتوں کو یکساں مفید نباتات سے مرکب ہیں قیمت بھی بہت کم ہے۔

۳۲ گولیاں ایک روپیہ

آزمائش شرط ہے یکمشت چار روپے کے خریدار کو ایک روپیہ کی دوا زیادہ ملے گی:۔

وید شاستری سجام نگر د کاٹھیاواڑ

تمدن

نوشتہ تقدیر

”دنیا میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو فلسفہ کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئیں“ کہتے ہیں کہ شہر لکھنؤ میں ایک بڑا ودیادان پنڈت تھا۔ قدرت نے اسکو سمجھنے والا دل اور دیکھنے والی آنکھیں عطا کی تھیں۔ ایک روز شام کے وقت وہ تن تنہا دریا کے کنارے ایک دور اور غیر آباد مقام پر سیر کر رہا تھا کہ اسکی نگاہ ریت پر کسی آدمی دبی ہوئی چیز پر پڑی جو سورج کی مغربی شعاعوں میں آئینہ کی طرح چمک رہی تھی۔ پاس جاکر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہے کہ کسی مردے کی پیشانی کی ہڈی ہے۔ قریب تھا کہ گرا دے مگر یکایک اسکی نگاہ چند لکیروں پر پڑی جو اسپر کچھ بے قاعدہ سی کھنچی ہوئی تھیں اور چونٹیوں کی رفتار سے مشابہ تھیں۔ پنڈت بہت سے ایسے علموں سے ماہر تھا جن سے عوام الناس ناواقف ہیں اور ایسی پُر اسرار باتیں پڑھ سکتا تھا جن کا دوسروں کو علم نہیں اسنے مُردے کی پیشانی کی تحریر کو بغور دیکھا۔ اسکے نوشتہ تقدیر کو اپنے علم کی رو سے سطح پر پڑھا

”جہاں کہیں سے بن پڑے بُری بھلی طرح اپنا پیٹ پالو گلیوں اور کوچوں میں مارے مارے پھرو۔ کھیت اور میدان میں سو۔ دریا کے کنارے پر کتے کی موت مرو۔ پھر ...... دیکھو ہوتا کیا ہے“

یہ الفاظ حیرت خیز اور تعجب انگیز تھے اور انکا مطلب اس سے بھی زیادہ

وحشت زا تھا مگر جس بات سے برہمن حیران تھا وہ یہ تھی کہ یہ تحریر اسوقت لکھی گئی تھی جب یہ شخص پیدا ہوا تھا اور خدا جانے کس کس مصیبت اور آفت سے اسنے زندگی کے دن پورے کئے ہونگے. اب موسے پر سو درّے کی مثال وہ کیا ہے جو اس غریب کو سہنا ہوگا اسے مرے ہوئے خدا معلوم کس قدر عرصہ ہوا ہے یہانتک کہ اسکے گوشت و پوست کا نشان بھی باقی نہیں رہا اور ہڈیاں گل سڑ کر خاک ہوگئی ہیں اسپر اب کیا باقی رہا ہے جو اسکو پیش آئے. اسی پیچ و تاب میں برہمن نے ٹھان لی کہ اب دیکھنا چاہیے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے اور ہڈی کو احتیاط سے اپنی دھوتی کے دامن میں باندھکر گھر کی طرف روانہ ہوا. گھر پہونچکر اسنے بڑی حفاظت سے اُس ہڈی کو اپنے کمرے میں ایسی چیزوں کے ساتھ جنکی اپنے پیشے کے متعلق اسکو ضرورت پڑتی تھی، اور جہاں اسکی نجوم اور رمل کی کتابیں رہتی تھیں نہایت پوشیدہ طور پر رکھا ہر روز صبح کے وقت اپنا بستہ کھولتا اور خبرداری سے جب کوئی دیکھتا نہو اس میں سے بدیں خیال وہ ہڈی نکالتا اور دیکھتا کہ اسمیں کوئی تغیر تو واقع نہیں ہوا. اسی طرح مدتیں گذر گئیں اور کچھ بھی ظہور میں نہ آیا. اس اثنا میں برہمن کی عورت اسکی تمام کارروائی سے آگاہ ہوگئی اور دل ہی دل میں بے قرار تھی کہ الٰہی یہ کیا کرتا ہے اور تاک میں رہتی کہ برہمن کسی وقت غافل ہو اور میں اسکا بستہ کھولکر اس راز سے واقف ہو جاؤں ایک روز قریب کے گاؤں میں ایک بچہ پیدا ہوا اور برہمن کو صبح سویرے مونھ اندھیرے وہاں سے بلاوا آیا اور اسکو فی الفور اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کے لئے جانا پڑا. عورت جو موقعہ کی تلاش میں تھی وقت کو غنیمت سمجھی اور فوراً برہمن کی کوٹھڑی میں گھس اور بستہ کھول کو ہر مقصود نکالا تو سوائے اُس استخوان بوسیدہ کے اور کچھ برآمد نہوا. بہت سٹ پٹائی کوئی بات سمجھ میں نہ آئی آخر سوچی کہ ہو نہو یہ ہڈی میری سوت کی ہے اور برہمن کو اس سے اسقدر محبت تھی کہ مرے بعد بھی اسکی

پیشانی اس حفاظت سے رکھی ہے اور صبح صبح اوٹھکر اسکی پوجا کیا کرتا ہے یہ
یہ خیال آنا تھا کہ آتش حسد سے آگ بگولا ہوگئی۔ ہڑی کو باورچیخانہ میں لیجاکر سل بٹے سے
پیسکر سرمہ کیا اور بدرو میں ڈالدیا۔ برہمن نے آکر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ پایا۔ آخر اپنی بیوی
سے پوچھا تو وہ پنجے جھاڑکر پیچھے پڑگئی اور گالی گلوج کا ایسا طوفان اٹھایا کہ بیچارہ
برہمن موہنہ دیکھتے کا دیکھتا رہگیا۔ آخر جب اسنے بتایا کہ میں نے اس کتیا مردار کی
ہڑی جسکا تم روز درشن کرتے تھے اور جسکی پوجا کے بغیر تم رہ نہیں سکتے تھے بدرو
میں ڈالدی تو اسنے وہاں جاکر دیکھا۔ مگر سوائے ایک بھوری بھوری خاکستر کے
جسمیں پاخانہ سے میلا کچیلا پانی بہ کر لگیا تھا اور کچھ نہ پایا۔ غرض استخوان شکستہ کا یہ انجام
ہوا۔ اور یوں اس خوفناک نوشتۂ تقدیر کی آخری پیشینگوئی پوری ہوئی۔

برہمن کچھ موہنہ میں بڑبڑاتا باہر چلا گیا اور جورو اپنی کامیابی پر گویا پھولی جامے میں
نہ سماتی تھی۔ رات کو خاوند اور بیوی آرام سے لئے اپنے کمرے میں سگئے بیوی تو
سوگئی اور خاوند کو موت اور حیات کے پیچیدہ مسئلے سوچتے سوچتے آدھی رات
ہوگئی اسوقت اسنے جو آنکھ اٹھاکر دیکھا تو اپنے بستر کے عین برابر چھت میں سے
ایک باریک سا تاگا لٹکتا ہوا پایا۔ پہلے تو کچھ خیال نہ کیا مگر رفتہ رفتہ تاگا بڑھکر اسکی
چارپائی کے قریب پہونچنے لگا۔ برہمن آنکھیں ملنے لگا اور قریب تھا کہ اپنی بیوی کو
آواز دے کہ تاگا ایک نہایت زہریلا سانپ بن گیا اور اسنے برہمن کی ناک پر
کاٹ کھایا۔ پیشتر اسکے کہ برہمن اٹھکر بیٹھے سانپ ایک روزن دیوار میں سے نکلکر
کمرہ سے باہر ہوگیا یہ بمشکل اٹھکر دروازہ کھولکر باہر نکلنے کو تھا کہ سانپ نے ایک
خوفناک بھیڑیئے کی شکل اختیار کی اور ہمسایہ کے بچے کو جو صحن میں سوتا تھا پھاڑ
کھایا۔ برہمن نے اب جان ہتیلی پر رکھ لی اور اسکے پیچھے پیچھے ہولیا اتنے میں
بھیڑیئے نے ایک نوجوان کی شکل اختیار کی اور برہمن کی طرف مڑکر متبسم نگاہوں

سے دیکھا۔ برہمن نے دلکو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور اسکے پاؤں میں گر پڑا کر یہ کیا ماجرا ہے اس نوجوان نے جواب ایسی آواز سے دیا جس میں نہ خفگی تھی نہ ناراضگی تھی کہ میں موت کا گماشتہ ہوں اور دنیا میں جس جس طرح لوگوں کی موت لکھی ہوئی ہے اسکو پورا کرنے آیا ہوں۔ بس اب میرا پیچھا نہ کرو۔

برہمن اپنی جان سے ہاتھ دھو چکا تھا تعاقب سے باز نہ آیا۔ فرشتہ نے پھر مڑ کر کہا کہ اب کیا چاہتے ہو برہمن نے کہا کہ میں صرف اسقدر پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری موت کس طرح لکھی ہے۔

موت کے گماشتہ نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ تم دلیر آدمی ہو مگر اب بھی اسکی آواز میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے ترس اور خوف پایا جاوے۔

برہمن اپنی بات پر اڑا رہا اور پھر وہی سوال کیا۔ اسپر فرشتہ نے رعد کی آواز میں جواب دیا کہ تم دریائے گنگا میں کام نہنگ کا طعمہ ہوگے۔ کیا تم اپنی تقدیر سے بھاگ سکتے ہو اور پیشتر اسکے کہ برہمن اس خوفناک پیشین گوئی کے معنے سمجھے نوجوان ہوا ہوگیا۔

برہمن نے گھر آکر۔ اپنی جورو کا کریا کرم کیا اور ہمیشہ کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ دیا اسنے اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ ہیبت ناک گنگا کے نزدیک نہ رہونگا۔ دیبی ہو یا کچھ ہو مگر ایسی جگہ جاکر رہونگا جہاں لوگوں نے اس خوفناک دریا کا نام بھی نہ سُنا ہو۔ کہنا آسان ہے مگر کرنا مشکل ہے۔ بجائے اسکے کہ مغرب کی طرف جاتا جہاں خواہ لوگوں نے گنگا نام تو سُنا ہوگا مگر اسکی شکل نظر نہ آتی وہ مشرق کی طرف روانہ ہوا اور آخر برما کے علاقہ میں پہونچ گیا۔ یہاں بود و باش اختیار کرلی۔ ایک چھوٹی سی جھونپڑی بناکر اُسے سجایا اور اپنے کاروبار میں مشغول ہوا۔ اسکی لیاقت اور دانشمندی کا جلد ہی شہرہ ہوگیا۔ اور وہاں کے مہاراج ادہراج کے دربار تک اسکی رسائی ہوگئی اتفاق سے مہاراجہ کو اپنے لڑکے کے واسطے ایک لائق پنڈت کی ضرورت تھی اسکے فضل و کمال کا شہرہ تو سُن ہی چکا تھا۔ اب دیکھا تو ہمہ دانی اور دانشمندی

میں اسے کہیں بڑھکر پایا۔ غرض اپنے لڑکے کا اتالیق مقرر کیا۔ برہمن کا حال کسی کو معلوم نہ تھا اور اس نے اپنی پہلی عمر کے واقعات کی طرف کبھی اشارہ بھی نہ کیا لڑکا اس اثنا میں بڑا ہو گیا اور اب وہ وقت آپہونچا کہ مہاراج نے اپنے تمام ارکین سلطنت کو جمع کر کے دریافت کیا کہ شہزادہ کی تعلیم کا کیا بندوبست کرنا چاہیے۔ سب نے عرض کیا کہ نوجوان شہزادہ تمام علوم میں یکتا اور سارے فنوں میں کامل ہو چکا ہے اب مناسب ہے کہ گھر سے باہر قدم رکھے اور سیر ممالک سے اپنی نظر کو وسیع کرے چنانچہ سب سامان سفر تیار ہوا اور شہزادہ نے اپنے اتالیق سے کہا کہ آپ بھی تشریف لے چلیں اتالیق نے صاف انکار کر دیا۔ یہ خبر مہاراجہ تک پہنچی جس نے پنڈت کو ہمیشہ نہایت مطیع اور وفادار پایا تھا اسکو اس سے نہایت مایوسی ہوئی اور پنڈت سے بضد ہوا کہ آپکو ضرور شہزادہ کے ہمراہ جانا ہوگا۔ پنڈت کو اب انکار مشکل ہو گیا اور ناچار اپنی رام کہانی اور گنگا رانی کی واردات سنانی پڑی۔ اسپر درباری اور خود شہزادہ بھی خوب قہقہہ لگا کر ہنسے اور پنڈت کی توہم پرستی پر اسکو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ پنڈت بہت کھسیانہ ہوا۔ مگر سب کے اصرار و خوشامد و انعام بیش بہا کے وعدوں سے شہزادے کے ہمراہ رکاب جانے پر راضی ہو گیا۔ مگر شہزادے اور اُسکے باپ سے اس امر کا وعدہ لے لیا کہ اگر کہیں شہزادہ دریائے گنگا کے نواح میں پہنچ جائے تو میں اپنے وطن کو لوٹ آؤنگا۔

لگن دیکھکر شہزادہ روانہ ہوا اور بہت سے مقامات کی سیر کی یہانتک کہ ان کا کیمپ جنوبی بنگال میں جا پہنچ گیا۔ برہمن نے اپنا وعدہ یاد دلایا مگر شہزادہ نے ایک نہ سُنی اور اپنا تمام فلسفہ اور منطق برہمن کو سمجھانے میں خرچ کر ڈالا کہ آخر آپکو اس مقدس دریا سے کیوں نفرت ہے۔ پھر کہا کہ تنخواہ و انعامات موجودہ سے

دس گنا لیجئے اور ایک بار میرے ساتھ چلکر دریا کے کنارے پر کھڑے ہو جائیے ورنہ لوگ کیا سمجھیں گے کہ آپ سا دانا ایسی وہمی باتوں کے خیال سے اپنے اوپر جگ ہنسائی کراتا ہے۔

شہزادے کا اصرار، انعام کی توقع اسپر ہمراہیوں کی چھیڑ چھاڑ برہمن کے شکوک لگے زائل ہونے اور انجام کار وہ راضی ہوگیا۔ فوراً ایک سو سورما جوان زرہ بکتر پہنے۔ ہتھیاروں سے اوپچی بنے۔ ڈھال تلوار لگائے اُچھل پڑے اور دریا کے کنارے پہونچے۔ شہزادہ اور اتالیق بھی آکر اپنے گھوڑوں سے اُترے اور دریا کی طرف دیکھنے لگے۔ پانی کس قدر صاف اور دریا کیسا خاموش تھا اسکے تمام وسعت پر ایک لہر تک نہ تھی۔ کیا اس میں گھڑیال ہوگا۔ سب بے اختیار ہنسنے لگے یہانتک کہ خود برہمن بھی اس خوشی میں شریک ہونے سے باز نہ رہ سکا اور وہ بھی مسکرانے لگا

شہزادے کے حکم پر ایک سو سپاہی پانی میں کود پڑے اور ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے ایک ایسی جگہ حلقہ باندھکر کھڑے ہوگئے جہاں کمر تک پانی آتا تھا۔ اس حلقہ میں شہزادہ کو اشنان کرنا تھا۔ اس وقت شہزادے نے مسکرا کر اپنے اتالیق کی طرف دیکھا جسپر برہمن سے نہ رہا گیا اور اسکے ہاتھ میں ہاتھ دیکر کہنے لگا میں ایسا بزدل بھی نہیں ہوں کہ آپکے ساتھ ایسی جگہ جہاں ایک سو مسلح جوان کھڑا ہی نہ نہا سکوں اس طرح سے ایک دوسرے کے ایک دوسرے کے ہاتھ میں دے کے مزے مزے کی باتیں کرتے دونوں پانی میں اُترے اور اس حلقہ میں جاکھڑے ہوئے۔ سورج اندر باہر تھا۔ نہانے والوں نے اشنان کا گیت گانا شروع کیا ایک لحظہ میں سب کا اپنے سر پانی میں ڈبو کر غوطہ لگانا تھا کہ یکایک شہزادہ ایک مہیب تک اور مہیب گھڑیال نکلے گھڑیال سے نگیج کر کہا کہ او برہمن میں وہی اجل کا گماشتہ ہوں اور برہمن کو کمر سے پکڑ کر مسلح آدمیوں کی صف چیر کر گہرے پانی میں لے گھسا اور نظروں سے غائب ہوگیا ❊ "عالم خیال"

یادِ اجل

"آسودگی بہ گوشۂ ہستی ندیدہ ایم — جاں دادہ ایم و کنجِ مزار خریدہ ایم"

میں اے اجل ہوں تیرا اُمیدوار کب سے! — تیری مفارقت میں ہوں بے قرار کب سے!
ہے میری جان اے جاں تجھ پر نثار کب سے! — کرتا ہوں آہ تیرا میں انتظار کب سے!
مجبور و مضطرب ہوں بے اختیار ہوں میں
اے مرگ تیری خاطر سینہ فگار ہوں میں

اے پُر ز نار نخوت۔ آن بان والی — اے غم فروش عالم۔ اونچی دوکان والی
اے صاحبِ عزت۔ برتر نشان والی — شرم و حیا کی دیوی۔ شاہانہ شان والی
جاں تیرے خیر مقدم کو رُک رہی ہے لب پر
دل کب سے تیرا رستہ تکتا ہے اے ستمگر

اے موت بندِ ہستی سے تو چھڑا دے مجھکو — آزاد کرکے اپنا بندہ بنا دے مجھ کو
صہبائے بیخودی کے ساغر پلا دے مجھکو — آ۔ حجرۂ لحد میں چلکر سلا دے مجھ کو
اے قبر ایک مدت سے وصل کا ہے ارماں
آغوشِ دل میں لے لے شفقت پہ تیری قرباں

میں ہوں فقط اکیلا۔ کچھ مال ہو نہ زر ہو — دو گز کا اک کفن ہو۔ کچھ ہو نہ پاس گر ہو
کھٹکا نہ رہزنوں کا چوروں کا کچھ نہ ڈر ہو — شادی کی کچھ خبر ہو۔ غم کا نہ کچھ اثر ہو
وہ دن کب آئینگے جب احباب روتے ہونگے
ہم اپنا منہ لپیٹے بے فکر سوتے ہونگے

غربت کی ہو نہ پروا۔ دولت کی ہو نہ حاجت — عزت کی ہو نہ خواہش ذلت سے ہو نہ نفرت
اعدا سے ہو نہ کینہ۔ یاروں کی ہو نہ اُلفت — اولاد کی محبت۔ ماں باپ کی نہ چاہت

محفوظ ہوں غرض ہم ان ساری آفتوں سے
بے فکر و مطمئن ہوں دنیا کی کلفتوں سے

کپڑا سفید سر سے پا تک تنا ہوا ہو ڈھیلوں کا ایک تکیہ سر کے تلے لگا ہو
اور خواب ہائے غفلت کا سلسلہ بندھا ہو لیکن نہ وہ پریشاں دنیا کے وہم سا ہو

اِس میٹھی نیند میں ہم کچھ ایسے بے خبر ہوں
غل شور سے ہوں ایمن نالوں سے بے خطر ہوں

سبزے کی سبز چادر مرقد پہ اک چڑھی ہو پھولوں کے بدلے جس پر حسرت برس رہی ہو
سنگِ لحد سے تصویر اک یاس کی کھڑی ہو جائے چراغ جس پر تاریکی چھا گئی ہو

سر پیٹتی ہو حسرت اور نوحہ خواں ہو ارماں
ماتم کرے تمنا۔ ہو شوق مرثیہ خواں

سنسان مقبرہ ہو۔ ہر سو ہو ہُو کا عالم اور لہلہا رہا ہو سبزے کا ایک پرچم
ہر پھول داغِ غم ہو۔ ہر نخل نخلِ ماتم آنسو بہا رہی ہو تربت پہ میری شبنم

تنہائی ہو محافظ خاکی مکاں کی میرے
اور بیکسی ہوں درباں اِس آستاں کی میرے

ہم جانتے ہیں لیکن اے موت تیری خصلت مکار بے حمیت۔ بدچشم۔ بے مروت
تو کب نکلنے دیگی دل کی ہماری حسرت ہے بے وفائی تیری معمولی ایک عادت

تجھ سے اماں جو مانگے اُس کے گلے لگے تو
جو دل سے تجھ کو چاہے اُس سے الگ رہے تو

آمد کا اپنی مژدہ سنوائے گی یقینی اور میری آرزوئیں بر لائے گی یقینی
آنے کو یوں تو اک دن تو آئے گی یقینی تو آج مجھ کو لیکن ترسائے گی یقینی
"نہ جاؤں گا میں کرتا اے موت تیری منت اور تو رہیگی یوں ہی مخمورِ خوابِ راحت"

نہر سویز

آج کل جبکہ ترکوں کے مصر پر حملہ کرنے کے متعلق نہر سویز کا اکثر ذکر ہوتا ہے اگر اس نہر کے ابتدائی اور مابعد کے تاریخی حالات لکھے جائیں تو خالی از دلچسپی نہ ہونگے۔

قدیم تاریخ نمبر ۱

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ نہر سویز بحیرۂ روم کو بحیرۂ قلزم سے ملاتی ہے۔ گویا جہازوں کے لیئے ایک سمندر سے دوسرے سمندر میں پہنچنے کا راستہ قائم کرتی ہے۔ زمانہ قدیم سے ہندوستان اور یورپ کی تجارت مصر ہی سے ہو کر گزرتی تھی۔ جہاں تک جہاز پہنچ سکتے تھے وہاں تک تجارتی مال جہازوں میں آتا تھا پھر خشکی کی راہ بحیرۂ روم کے کنارے تک جاتا تھا۔ اس تکلیف کو زمانہ قدیم کے بادشاہوں نے بھی ایسا ہی محسوس کیا جیسا کہ موجودہ زمانے کے حکمرانوں نے۔

چنانچہ سب سے پہلے مصر کے مشہور بادشاہ سیتی اوّل نے مسیح سے ۱۳۸۰ برس قبل اِس نہر کے تیار کرنے کا خیال کیا۔ بعض یونانی مؤرخین دوسرے بادشاہوں کا نام بھی لکھتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ اس نہر کی تیاری میں ایک لاکھ سے زیادہ مزدور رنجا۔ اور وبائی بیماریوں میں کام آئے ایسا ہونا بالکل ممکن ہے کیونکہ ہم موجودہ زمانے میں دیکھتے ہیں کہ پناما کی نہر کی تیاری میں بھی ایسا ہوا اور بہت سی جانیں اِس قسم کی وبائی بیماریوں میں ضائع ہوئیں۔

بادشاہ سیتی کی نہر دریائے نیل سے نکلکر کھاری جھیل میں اُلٹی تھی اس نہر کے نشان آجتک پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور بادشاہ نے یہ کام شروع کیا مگر ناتمام رہا۔
مسیح سے ۵۰۰ برس قبل بادشاہ دارا نے اس نہر کو بحیرہ قلزم سے ملانا چاہا اور بہت حد تک کامیاب ہوا۔ مگر بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ پانی جاری نہیں کیا گیا کیونکہ اندیشہ تھا کہ بحیرہ قلزم کی سطح بحیرہ روم سے بلند ہونے کی وجہ سے اس نہر کے کھودنے سے سارا ملک مصر پانی کی طغیانی سے غارت ہوجائیگا کہتے ہیں کہ اس مشکل کو آسان کرنے کی غرض سے طالمی دوم کے زمانے میں نہر میں بند بنائے گئے اور نہر بہمہ وجوہ مکمل صورت میں آئی۔ اُسوقت اس کا طول ۹۲ میل عرض ایک سو فیٹ اور عمق ۴۰ فیٹ تھا۔ لیکن موجودہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ نہر کی تکمیل دارا کے زمانے ہی میں ہوگئی تھی۔ بہرحال اسکی تکمیل کسی بادشاہ کے زمانے میں ہوئی ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ایک قدیم زمانے سے یہ نہر موجود تھی۔ مگر رفتہ رفتہ بند ہوگئی۔ شاہان روما نے اسکو دوبارہ کھدوانا چاہا اور آخرش ساتویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے مصر پر قبضہ کیا تو حضرت عمرؓ کے حکم سے اس نہر کو پھر جاری کیا گیا۔ ادعرصے تک یہ نہر جاری رہی ۷۶۷ء میں خلیفہ دوم ابوجعفر شاہ منصور بانی بغداد کے حکم سے اسے بند کرا یا گیا اور پھر اسی طرح بند پڑی رہی اگرچہ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ۱۰۰۰ء میں سلطان حکیم کے عہد میں یہ نہر جاری ہوگئی تھی۔ اگر ایسا ہوا بھی ہو تو بھی اس کے بعد یہ نہر پھر بند ہوگئی۔ آخرکار ۱۸۶۳ء لغایت ۱۸۶۹ء میں فرانس کے مشہور انجنیروں نے اسی نہر کو

جس کی ابتدا دو ہزار پانچسو برس پہلے ہوئی تھی دوبارہ کھودنا شروع کیا اور تھوڑے سے تغیر کے بعد اسکی وہ صورت قائم کی جو آجتک موجود ہے۔

نہر سویز کی موجودہ تاریخ نمبر ۲

اوپر جو بیان کیا گیا ہے وہ دریائے نیل سے نہر نکالنے کے متعلق ہے۔ لیکن اس کے علاوہ خشکی کے راہ دوسرے راستے سے نہر نکالنے کی تجویز بھی آٹھویں صدی عیسوی میں خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں زیر بحث ہوئی تھی لیکن چونکہ خلیفہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ اس بحری راستے سے اس کے رومی دشمن عرب تک پہنچ جاوینگے اس لئے اس منصوبے کو ترک کر دیا۔ پھر پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اہل وینس نے مصری حکمرانوں سے اس نہر کے اجراء کے متعلق گفت وشنید کی لیکن اسی زمانے میں ترکوں نے مصر پر قبضہ کر لیا اور اہل وینس خاموش ہو رہے۔ ۱۶۷۱ء بادشاہ فرانس کو اسکے وزیر نے مصر پر حملہ کرنے اور ایک نہر بنانے کا مشورہ دیا۔ ۱۷۷۰ء میں شیخ البلاد علی بے نے اس کام کو پورا کرنیکا ارادہ کیا۔ ۱۷۹۸ء میں نپولین بوناپارٹ نے نہر کھودنے کے خیال سے زمین کی پیمائش کرائی مگر انجنیروں میں اس امر پہ بہت اختلاف رہا کہ بحیرہ قلزم و بحیرہ روم کی بلندی سطح میں بہت فرق ہے ۱۸۴۷ء کی تحقیقات سے یہ بلندی سطح کا فرق غلط ثابت ہوا۔ ۱۸۵۴ء میں فرڈننڈ ڈی لسپ نے سعید پاشا خدیو مصر سے نہر بنانے کی اجازت حاصل کی۔ شرط یہ قرار پائی تھی کہ ۹۹ سال کے لئے اجارہ دیا جائے اور اس کے بعد نہر حکومت مصر کے قبضے میں آجائیگی۔ مگر چونکہ مصر سلطان ٹرکی کے ماتحت تھا اس لئے باب عالی سے منظوری حاصل

کرنی ضروری تھی۔ اس زمانے میں جنگ کریمیا کی وجہ سے ٹرکی اور انگلستان کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے اور انگلستان اس نہر کی تکمیل کے خلاف تھا۔ انگلستان کے وزیر لارڈ پامرسٹن نے بیان کیا کہ اول تو ایسی نہر تیار ہونی محال ہے اور اگر یہ تیار ہوگئی تو انگریزوں کو اس سے بجائے فائدہ کے یہ نقصان پہنچیگا کہ بحیرہ روم کی سلطنتیں خاصکر فرانس مشرق میں انگریزی بحری غلبے کی مزاحمت کریگا۔ اس بنا پر انگریزی سیاسی ریشہ دوانیوں سے باب عالی ۱۸۵۴ء سے ۱۸۶۶ء تک اس نہر کے ٹھیکے کے معاہدے کو منظور نہیں کیا مگر لسیپ نے نہر سویز کی کمپنی کا کام ۱۸۵۴ء ہی سے شروع کر دیا تھا اور باوجود انگریزوں کی ٹرکی کے ذریعہ ہر قسم کی مزاحمت میں نہر کھدنی شروع ہوگئی اور ۱۸۶۹ء میں جاری ہوگئی۔ اس نہر کی لاگت کا تخمینہ ۴۳۲۸۰۷۸۸۲ فرانک ہوتا ہے اگرچہ ۱۸۵۶ء میں اسکی لاگت کا تخمینہ صرف ۲۰ کروڑ فرانک کیا گیا تھا ۲۰ نومبر ۱۸۶۹ء کے بعد سے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدہ شروع ہوگئی تھی۔

اس نہر کا طول پورٹ سعید سے سویز تک سو میل ہے۔ شروع میں اسکا عرض کم تھا حتیٰ کہ دو جہاز برابر ہوکر نہ گزر سکتے تھے لیکن بعد کو اسکو زیادہ چوڑا کیا گیا اور اب دو جہاز اس طرح برابر سے گزر سکتے ہیں کہ ایک جہاز ٹھہر جائے اور دوسرا پاس سے نکل جائے۔ ۱۸۶۶ء تک اس نہر کے عبور کرنے میں جہازوں کو ۳۶ گھنٹے لگتے تھے لیکن اب صرف نصف وقت درکار ہوتا ہے

حق ملکیت

حق ملکیت کے لحاظ سے یہ نہر کسی ایک شخص یا بادشاہ کی نہیں ہے۔ ۱۸۸۸ء کے معاہدے کی رو سے تمام اقوام و ممالک کو جو عہدنامہ میں شریک تھیں برابر کے حقوق حاصل تھے اور کسی ایک کو دوسرے سے زیادہ حق نہ تھا۔ اور ہر تجارتی جہاز بلا روک ٹوک اسمیں سے گزر سکتا تھا مگر ۱۸۸۲ء میں جبکہ انگریزوں اور فرانسیسوں کی لڑائی ہوئی تھی اور انگریزوں نے فرانسیسوں کو مصر میں شکست دی تھی اور بحری لڑائی اسی نہر کے کنارے ہو رہی تھی تو چار دن کے لئے انگریزی امیر البحر نے اس نہر کا راستہ بند کر دیا تھا۔ یہ معاملہ بعد میں زیر بحث آیا اور ۱۸۸۸ء میں قسطنطنیہ میں ایک کمیٹی نے جس میں انگلستان۔ جرمنی۔ آسٹریا۔ اسپین۔ فرانس۔ اٹلی ہالینڈ روس اور ٹرکی کے نمائندے تھے نہر سویز کے معاہدے پر دستخط کئے جس کی رو سے اس امر کا فیصلہ ہو گیا کہ یہ نہر زمانہ امن و زمانہ جنگ میں ہمیشہ اور ہر وقت ہر جنگی و تجارتی جہاز کے لئے کھلی رہیگی خواہ وہ جہاز کسی ملک کا ہو لیکن برطانیہ کلاں نے ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ اس معاہدے کی شرائط اس حد تک قابل تسلیم ہونگے کہ جس حد تک کہ برطانیہ کے مصر پر قبضہ قائم رکھنے میں خلل نہ آئے۔

اس موقعہ پر یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ انگریزوں کو جو شروع ہی سے اس نہر کے مخالف تھے اسکے معاملات میں رائے زنی کا حق کس طرح حاصل ہوا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصر پر قبضہ ہونیکی وجہ سے لیکن اصلیت یہ ہے کہ اسمٰعیل پاشا خدیو مصر نہایت فضول خرچ شخص تھا اور وہ اسقدر مقروض ہو گیا کہ اُسنے ۱۸۷۵ء میں نہر سویز کے حصے انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالے۔ چنانچہ سلطنت برطانیہ نے نہر سویز کے ۱۷۶۶۰۲ حصے ۳۹۷۶۵۸۲ پونڈ میں خریدے اور اسطرح اسوقت نہر سویز کے

مغل شہزادوں کی تعلیم

رسالہ "موڈرن ریویو" میں اورنگ زیب کا ایک خط شایع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سترھویں صدی میں مغل شہزادوں کی تعلیم و تربیت کا ڈھنگ کیا تھا۔ یہہ اصل خط فارسی زبان میں ہے مگر رسالہ مذکور میں بزبان انگریزی ترجمہ ہوکر شایع ہوا ہے جس سے ہم ترجمہ کرکے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

اکتوبر سنہ ۱۶۵۴ء میں خود اورنگ زیب بادشاہ بڑا بیٹا محمد سلطان جس کی عمر ابھی صرف پندرہ سال ہے اجمیر کو مغل اعظم (شاہجہاں) کی حضور میں باریاب ہونے کے لئے جا رہا ہے۔ اورنگ زیب کو قدرتی طور پر یہہ فکر ہے کہ اوس کا بیٹا شاہی دربار میں عمدہ اثر قائم کرے۔ اوس کی نسبت اورنگ زیب نے شہزادے کو جو ہدایتیں لکھی ہیں اون میں ہر وقت اور ہر کام کا ایک نہایت مکمل دستور العمل موجود ہے۔

اورنگ زیب لکھتا ہے سفر و حضر میں طلوع آفتاب سے ۷۲ منٹ قبل بیدار ہو جاؤ۔ غسل اور حوائج ضروریہ سے ۴۸ منٹ میں فارغ ہوکر نماز شروع کرو۔ نماز اور اوراد کے بعد بعد قرآن شریف تلاوت کرو اس کے بعد ناشتہ کہاؤ۔ اگر سفر میں ہو تو طلوع کے ۴۸ منٹ بعد تک گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔ اگر راستہ میں شکار کرو تو اس بات کا ضرور لحاظ رکھو کہ منزل پر ٹھیک وقت پر پہونچ جاؤ منزل پر پہونچنے کے

بعد اگر تمہارا دل چاہے یا فرصت ہو تو عربی کی کوئی کتاب مطالعہ کرو۔ یا آرام کرو۔ زوال آفتاب کے ۲۴ منٹ کے بعد خیمہ سے نکلو اور ظہر کی نماز باجماعت اَدا کرو۔ دوپہر کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کرو۔ اس میں دو گھنٹے صرف ہوجاویں گے۔ اس کے بعد عصر کی نماز پڑھو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوپہر کا کھانا ظہر و عصر کے درمیان کھایا جاتا تھا۔ ایڈیٹر) لیکن اگر صرف کھانے ہی سے تمہیں کافی تفریح حاصل ہوجائے تو درمیان کا خالی وقت املار و انشار اور فارسی نظم و نثر کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرو نماز عصر کے بعد کچھ دیر عربی پڑھو۔ اور اس کے بعد نماز مغرب سے ۲۴ منٹ قبل علمار و صلحار کی صحبت سے استفادہ کرو۔ اور اس شغل کو نماز مغرب سے ۴۸ منٹ بعد تک جاری رکھو۔ اسکے بعد قرآن کے ایک پارہ کی تلاوت کرو۔ اور اس کے بعد نو بجے سوجاؤ۔ اگر تم سفر میں ہو تو منزل کے روز تمام کام اوقات معینہ پر انجام دو۔ اور کوچ کے زمانہ میں صبح کے ۴۸ منٹ تیر و تفنگ کی مشق میں صرف کرو۔

کوچ کی حالت میں ۴۸ منٹ تیر اندازی و نشانہ بازی کی مشق میں صرف کرو۔ طلوع آفتاب کے ایک گھنٹہ ۲۴ منٹ بعد ۴۸ منٹ دیا حسب ضرورت زیادہ عرصہ) کے لئے دربار عام میں نشست کرو۔ اگر ضرورت ہو تو تقریباً ایک گھنٹہ دربار خاص میں اجلاس کرو۔ ورنہ اس وقت کو عربی کے مطالعہ میں صرف کرو۔ اگر منزل طویل ہو تو نماز فجر کے بعد فوراً گھوڑے پر سوار ہوجاؤ اور ناشتہ راستہ ہی میں کرو۔ ورنہ روانہ ہونے سے قبل ناشتہ کرلو۔ سپیدہ صبح نمودار ہونے کے وقت یا نو بجے دن کے بعد سفر کا آغاز نہ کرو۔ اگر راستہ میں خطرکا کہیں ہو تو فوج کو قریب تیں

راستے سے منزل کی طرف نہ بڑھو اور سپاہ کی معیت میں رہو۔ اگر زیادہ ... اپنے ہمرکاب صرف نہایت مختصر جمعیت رکھو۔ رفتہ رفتہ ہتھیار لگانے کی عادت ڈالو۔ کپڑے اوتارنے اور لیٹنے سے قبل پسینہ خشک ہونے دو۔ سوائے محمد طاہر کے (یہ شخص محمد سلطان کا اتالیق ہے۔ ایڈیٹر) میرے کسی افسر کو یا شاہی کے دو ہزاری سے نیچے درجے کے عہدہ دار کو اپنی فوج سے آگے نہ چلاؤ۔ کیونکہ نوآزمودہ کاروں کی فوج سے آگے ہونے سے اوس کے رعب و داب میں فرق آتا ہے۔ ہمیشہ ناقل دول بات کرو۔

باوجود اس اہتمام کے معلوم ہوتا ہے کہ محمد سلطان نے تعلیم میں زیادہ ترقی نہ کی۔ یہاں تک کہ اپنی خاندانی زبان ترکی سے بھی ناواقف تھی۔ باوجودیکہ اورنگ زیب نے خاص زبان ترکی کی تعلیم کے لئے ایک معلم مقرر کر رکھا تھا۔ اورنگ زیب نے ایک بار شکایت کی تھی کہ ترکی زبان کا معلم ایک سال سے مشاہرہ لے رہا ہے۔ مگر تم نے اوس سے پڑھنے کی کوشش نہیں کی"۔

اورنگ زیب نے لباس وغیرہ کے متعلق بھی شہزادہ کو ہدایات کی ہیں اور اپنا نمونہ اوس کو یاد دلایا ہے۔

بہرحال محمد سلطان ماہ دسمبر میں شاہجہاں کے دربار میں پہونچ کر مورد عنایات و الطاف شاہانہ ہوا ہے۔ غالباً ناظرین کو محمد سلطان کی آئندہ زندگی کا حال معلوم کرنے کا بھی اشتیاق ہوگا۔ اس کی کیفیت مختصراً یہ ہے کہ تمام تعلیم و تربیت محض بیکار ثابت ہوگی۔ اور یہ مضمون صادق آیا کہ۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست　　در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

اورنگ زیب طریق انتشار معلوم کرنے کے لئے اوس کو اکبر نامہ کے مطالعہ کا حکم دیتا ہے اور وہ اوس کی یہاں تک تقلید کرتا ہے کہ بجائے بسم اللہ کے "اللہ اکبر جل جلالہ" میں بھی ابوالفضل کا تتبع کرتا ہے۔ اورنگ زیب کو جب بھائیوں سے لڑنا پڑا ہے تو کئی معرکوں میں وہ اورنگ زیب کے ساتھ تھا۔ آخر کار وہ شجاع سے مل گیا۔ مگر شجاع کی شکست کے بعد اوس نے اپنے آپ کو اورنگ زیب کے سپہ سالار میر جملہ کے حوالہ کر دیا۔ اسکے بعد عمر بھر اول گوالیار اور پھر سلیم گڈھ متصل دہلی میں قید رہ کر بعمر سی و ہفت سالگی۔ ۳ دسمبر سنہ ۱۶۷۶ء کو راہی ملک بقا ہوا

(انسٹیٹیوٹ گزٹ)

ناظرین براہ کرم خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں۔

منیجر

ابونصر فارابی
معلم ثانی

ابونصر لقب اور محمد ابن محمد ابن اوزلغ بن طرخان نام تھا فاراب[1] اوسکا وطن آبائی تھا۔ یہ ایک کماندر کا ہونہار لڑکا تیسری صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوا۔ مدت تک بغداد میں رہا پھر شام میں جا بسا اور مرتے دم تک وہیں رہا معلم ارسطو کے فلسفہ کو اسی نے اہل اسلام کے سامنے پیش کیا اور اِسی صلہ میں علمی دربار سے خطاب معلم ثانی حاصل کیا۔

اگرچہ نصر سے پہلے مسلمانوں کو یونانی فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ مگر ارسطو کی نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں کو ایک دوسری زبان مدرکا تھی قدرت سے اسرار ایک ترجمان کی ضرورت محسوس کر رہی تھی اوسوقت تک یونانی فلسفہ عربی میں نہایت بھدے اور ناموزوں تجربوں کے لباس میں تھا۔ جن سے فایدہ اوٹھانا معلوم ہے جان الفاظ کے پیکروں میں۔ روح معانی کے جلوے نگاہ تصور کو بھی نظر نہ آتی تھی۔ تخیل سادہ ج تو کیا باریک بیں عقول بھی مصنوعی فہم وادراک کا دعویٰ کرنا اپنی موت

[1] فاراب ترکستان میں نہر سیحوں کے پرے بلاساغون کے قریب ایک شہر ہے جو طول میں ایک دن کی مسافت رکھتا ہے۔

سمجھتی تھی کہ یہ نامور وجود خاک پاک پارس سے اٹھا اور حقائق اشیاء کے اظہار کا چمکتا آفتاب تمام عالم افکار میں روشن کر دیا۔ جس کی کرنیں عرب و عجم بلکہ یورپ و امریکہ کے فلاسفروں کے خلوت کدہ تخئیل میں پہونچ گئیں اوس نے فلسفہ کی تجلیوں کو دیکھا اور وہ اس کے فیض نظر سے ایسی ہو گئیں کہ آج ہم سب دیکھ سکتے ہیں۔

ارسطو جو حقیقت میں یونانی فلسفہ کا موجد گزار رہے اگرچہ قدما کی طرح فلسفہ کی عام تعلیم کا مخالف نہ تھا کہ سوا خاص شاگردوں کے اور کسی کو ایسی قیمتی جواہر کی طرف نگاہ کرنے کی بھی اجازت نہ دیتا اور ہمیشہ رمز و اشارات کے صندوقوں میں محفوظ رکھتا۔ مگر اوس کے بسیط مضامین بھی معمولی ذہنوں کی چاردیواری میں نہ سما سکتے تھے۔ اوس نے گو افلاطون الٰہی کی طرح تعلیم فلسفہ کے لئے اپنی ہیکل کے دروازہ پر یہ نہیں لکھدیا تھا کہ جو علم ہندسہ نہ جانتا ہو ہمارے پاس نہ آئے لیکن اوسکا تسلسل خیالات اور مقدمات تمہیدیہ کا سلسلہ بھی فہم و خرد میں بھی نہ آنے پاتا تھا۔ کہ مخاطب کثرت غور و خوض سے مجنوں ہو جاتا تھا۔

ابونصر نے ارسطو کی کتابوں پر کثرت سے تعلیقات لکھے اوس کے مجمل بیانوں کی تشریح اور کندی وغیرہ مترجمین کی اغلاط کی تصحیح کردی جس سے عربی خزانہ افکار میں یونانی جواہر کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔ یونانی فلسفہ عام ہو گیا۔ اور عام و خاص اوس سے مستفید ہونے لگے ابونصر خود ساختہ غریب و فقیر تھا، وہ ابتدا میں ایک باغ سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر اسپر بھی اوس نے اپنے تمام مشاغل فلسفہ کے لئے وقف کر دیئے تھے ارسطو کی کتابیں بڑی گراں تھیں اور ابونصر تنگدستی کی وجہ سے مول

نہیں دے سکتا تھا۔ مگر اتفاق سے ایک اجنبی ارسطو کی تمام کتابیں اوس کے پاس چھوڑ گیا اب کیا تھا ابونصر نے اون کتابوں کے دیکھنے کا حق ادا کر دیا۔ کثرت غور و خوض سے وہ اون کے تمام مطالب پر حاوی ہو گیا۔ وہ مطالعہ و تصنیف کی ضرورت سے رات بھر جاگتا رہتا تھا۔ اتنی استطاعت کہاں تھی کہ دمڑی کا تیل چراغ میں ڈالتا اور ایک گوشہ میں بیٹھکر مطالعہ میں مشغول ہوتا۔ غریب ساری رات اپنے گھر سے نکلکر چوکیداروں کی لالٹینوں کی روشنی میں پڑہتا پھرتا تھا۔ خدا نے اُسے ایسا ذہن دیا تھا کہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ فیلسوف اعظم شمار کیا جانے لگا فلسفہ مشک سے بڑھکر خوشبودار ہے وہ اگرچہ فلسفی کی نافۂ دماغ میں محفوظ رہتا ہے مگر فلاسفر کی ہر نفس نکہات طیبہ بنکر مشام سامع کو معطر کرتے رہتے ہیں یہی سبب تھا کہ ابونصر تو ایک گوشہ میں تھا۔ مگر اوس کی باتیں جہان میں تھیں۔

غرض اوس کے علم و فضل کے دُور دُور چرچے ہونے لگے۔ ہر وقت شاگردوں کے جمگھٹے رہتے تھے حلقہ درس میں بڑے بڑے جلیل القدر امرا مسائل فلسفہ کی دلچسپ تقریریں سُننے کے لئے شامل ہوتے تھے شدہ شدہ یہ خبر امیر سیف الدولہ کو پہونچی سیف الدولہ بڑا جوہر شناس اور علم دوست تھا۔ اوسکا دربار علم و فضل کا دربار تھا۔ جس نے متنبی کے دیوان میں سیفیات کو پڑہا ہے وہ سیف الدولہ کی عظمت و شان کا کچھ اندازہ کر سکتا ہے۔ غرض سیف الدولہ نے ابونصر کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور قبیلۂ تغلب کے اس مغرور امیر کو ابونصر کے فضایل کا اعتراف کرنا پڑا۔ دربار کے اراکین ابونصر کو دیکھنے اور اوسکے ساتھ گفتگو کرنے کو فخر سمجھنے لگے۔ ادھر سیف الدولہ کے عزا نے زدری تاک میں سے تھے۔

کہ جس طرح ہوا اس کے نگ بلند کو اجسام ترابیہ کی طرف مائل کریں اور فانی لذتیں غلبہ پاکر اسی منازل نفوس باقیہ سے دور کردیں۔ مگر وہ جو آزادانہ منظر اقدس کو دیکھ رہا ہے اور عالم اعلےٰ کی وسعت حریت کے نغمونپر کان لگائے ہوئے ہے عناصر اربعہ کی چاردیواری کا ہوکر نہیں رہ سکتا دنیاء دنی کی پست آوازیں اوس کے عالم سامعہ تک نہیں پہونچ سکتیں

ابونصر نے بھی اپنے کمال بیرغی کو ظاہر کیا۔ اور ان مذموم علائق سے منہ پھیر لیا۔ اگرچہ ہموم دنیہ سے مطلقاً نجات پانا۔ اور اونکے اسباب دفع سے قطعاً اغماض کرنا فطرت انسانیہ کے خلاف ہے۔ ابونصر نے بقدر ضرورت صرف چار درم یومیہ لینا منظور کیا۔ اور سیف والدولہ کے یہاں سے یہی روزینہ مقرر ہوگیا۔ ابونصر فیشن کا دلدادہ یا دنیاوی طرز معیشت کا مقلد نہ تھا بلکہ وہ خود انسانی زندگی کا ایک کامل نمونہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اگر ایسی جدوجہد حیات کے نمونے آج ہمارے پیش نظر ہوتے تو ہم وہی ہوتے جو ہمیں ہونا تھا۔ ابونصر راہبوں کی طرح ایک ہستی بیکار نہ تھا بلکہ اوسکا زہد اختیاری دنیاوی جاہ ومنزلت کی ناقدری اور بے ثباتی کا بہت بڑا واعظ تھا۔ وہ اپنے قول وعلم سے نہیں بلکہ عمل وفعل سے ابناء دہر کا روحانی معلم تھا۔ وہ انھیں بتاتا تھا۔ راغب

دُنیاء دنی اور یہ شوق تحصیل کیوں تم سے کیا ہے اپنی ہمت کو ذلیل

سمجھو تو یہی کس کے عوض بکتے ہو کہتا ہے خدا متاع دُنیا ہے قلیل

ابونصر کی زاہدانہ زندگی کی حد ہوگئی اوس نے آخردم تک کسی منزل وکسب کی طرف مستقل توجہ نہیں کی وہ اگرچہ ابتدا میں قاضی ہوگیا تھا مگر جب اوسپر معارف کھلنے اوس نے فوراً استعفا داخل کردیا۔ اور

ہمہ تن تحصیل فلسفہ میں مشغول ہوگیا۔ اوس سے ایک شخص یوحنا بن جیلان نامی سے زمانہ خلافت مقتدر میں فلسفہ آخر کتاب البرہان تک پڑھا۔ کتاب البرہان کا آخری حصہ درس میں نہ تھا مگر ابونصر کے زمانہ سے درس میں داخل ہوگیا تھا۔ افسوس ہے البرہان کا آخری حصہ تو کیا البرہان بھی ہمارے درس فلسفہ میں داخل نہیں۔ اور آج ہمارے طلبا سے فلسفہ اوس کی زیارت سے بھی محروم ہیں۔ ابونصر کے زمانہ تحصیل فلسفہ میں ایک شخص ابو البشر متی بن یونان فلسفی بھی تھا۔ اس نے ابراہیم مروزی سے فلسفہ پڑھا تھا۔ متی اگرچہ بڈھا ہوگیا تھا مگر مسائل فلسفہ میں ابونصر کی طرح ژرف نگاہی اُسے نصیب نہ تھی اور نہ وہ ابونصر کی برابر ذہین وفہیم تھا متی ایام خلافت راضی میں ۳۲۳ھ لغایت ۳۲۹ھ کے دوران انتقال کر گیا۔ پھر تو ہر جگہ ابونصر ہی ابونصر تھا۔ شروع شروع میں ابونصر کو نحو اچھی نہیں آتی تھی اوس نے ابوبکر بن سراج نحوی سے نحو پڑھنا شروع کی اور اسکے معاوضہ میں اوسے منطق کا درس دیا۔

ایسے علم وفضل پر بھی اوسکا یہ عالم تھا کہ جب کسی نے پوچھا کہ تم زیادہ فلسفی ہو کہ ارسطو۔ تو اوس نے صاف الفاظ میں کہدیا کہ اگر میرے زمانہ میں ارسطو ہوتا تو میں اوس کے ایک شاگرد سے بڑھکر نہ تھا۔

ابونصر فلسفہ کا امام تھا۔ اور تمام متاخرین میں اوس کے مقتدی اوس نے محققانہ بلکہ مجتہدانہ انداز سے فلسفہ کی تمام شعبوں میں اپنے کمالات دراک کا ثبوت دیا ہے یہانتک کہ وہ موسیقی کا بمثال اوستاد تسلیم کیا گیا۔ اوس نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جس کے نغمے جذبات سامع میں آگ لگا۔ تے سنتے نغمے حلقہ سامع میں ہنسا رہتا سو جانا سننے والے کے

اختیار میں نہ تھا۔ بلکہ ابونصر کے ارادہ اور اوس آلہ کی ایک معجزہ کے اشارہ میں تھا۔ خلکان نے لکھا ہے کہ ابونصر جب سیف الدولہ کے علمی دربار میں پہونچا تو کانہ انداز تھا اور اسی طرح سیف الدولہ کے سامنے کھڑا ہوگیا سیف الدولہ نے کہا بیٹھو فرمایا کس حیثیت سے حیث آنا۔ ام حیث انت۔ سیف الدولہ نے کہا حیث انت سنتے ہی آگے بڑہا اور مسند شاہی تک پہونچکر سیف الدولہ سے بھڑ گیا یہانتک کہ وہاں سے ہٹایا گیا۔ سیف الدولہ کے پیچھے اوس کے مسلح غلام کھڑے رہتے تھے جن سے اسلحہ آداب دربار کی بڑی زبردست نگراں اور اون کے ابرو سے شمشیر بادشاہ کی ادا فہم نگہبان تھے۔ سیف الدولہ ایک خاص زبان میں اُنھیں احکام دیتا تھا۔ اب بھی اوس نے اوسی زبان میں اون سے کہا اگرچہ اس بڈہے نے آداب شاہی کا لحاظ نہیں کیا مگر میں اس سے کچھ پوچھتا ہوں اگر جواب نہ دے سکے تو اس کے تم ٹکڑے اُڑا دینا۔ ابونصر نے یہ سُنکر فوراً بادشاہ سے کہا کہ صبر کیجیے۔ مرد آخر بیں مبارک بندہ است۔ سیف الدولہ یہ سنکر بڑا متعجب ہوا اور اوس سے کہا کیوں جی تم یہ بھی زبان جانتے ہو اوس نے کہا جی ہاں میں ستر سے زیادہ زبانیں جانتا ہوں پھر علمائے حاضرین سے ابونصر کی گفتگو ہوئی اور اوس نے ہر فن میں علما کا ناطقہ بند کردیا۔ علما کو چُپ کر دینے کے بعد اوس نے خود تقریر شروع کی اور لوگوں نے قلم دوات سنبھالے۔

پھر سیف الدولہ نے پوچھا کچھ کھایئے گا۔ اوس نے کہا نہیں۔ پینے کو پوچھا تو بھی انکار رہا سیف الدولہ نے کہا اچھا تم کچھ سنو گے اب کے جواب اثبات میں تھا۔ سیف الدولہ کے حکم سے محفل سماع منعقد ہوئی

اب کوئی سازندہ یا نوازندہ ایسا نہ تھا جسے ابونصر نے نہ ٹوکا ہو اور جسکے آلات طرب طبلہ سارنگی میں عیب نہ نکالا ہو۔ سب نے اپنا اپنا کان پکڑا اور ہاتھ جوڑکر یا اوستاد ٹھیک ہے۔ جی حضور بجا ہے۔ کہکر چپ ہوگئے پھر ابونصر نے خود ایک تھیلی میں سے چند لکڑیاں نکالیں اور انہیں ترکیب سے ایک بنالیا پھر جب اُسے بجایا تو محفل کی محفل ہنستے ہنستے لوٹ گئی پھر دوبارہ ترکیب دیا اور بجایا تو سارے دربار کا روتے روتے غیر حال ہوگیا۔ تیسری دفعہ نئی ترکیب دیکر جب اوس نے بجایا ہے تو اہل مجلس خواب راحت میں تھی دربان تک سوگیا اور ابونصر سبکو سوتا چھوڑکر چلدیا۔ غلکاں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابونصر شام کے آبشاروں اور باغوں میں اوقات بسر کرتا تھا۔ اور وہیں تصنیف و تدریس کا سلسلہ رہتا تھا وہیں اس کے حواری اوس سے فیض پاتے تھے اسی بے سروسامانی کے باعث اوس کی کتابیں اکثر ناقص رہ گئی ہیں جب اسی برس کی عمر ہوئی ۳۳۹ھ میں دمشق میں وفات پائی سیف الدولہ نے چار اراکین کے ساتھ نماز پڑھی بیروں دمشق باب صغیر کے باہر دفن کیا گیا بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ ابونصر نے ۳۳۸ھ میں مصر کا سفر کیا اور وہاں سے لوٹ کر دمشق میں سکونت اختیار کی اور وہیں رجب ۳۳۹ھ میں انتقال کیا۔ اس زمانہ میں خلافت عباسیہ پر خلیفہ راضی کا نام تھا۔ سیف الدولہ نے پندرہ خواص کے ساتھ نماز پڑھی۔ واللہ اعلم +

راغب جیلانی۔ بدایونی۔

قدیم ہندوستان کی تہذیب

(مترجمہ - اے - ڈی - احمد صاحب)

کسی قومیت تمدن کی اشاعت اور اُسکی قومیت کے قیام کے لیئے تاریخ کا مطالعہ جسقدر ضروری ہے وہ محتاج بیان نہیں کسی انگریزی مؤرخ کا قول ہے کہ جو قوم اپنے بزرگوں کے کارنامے نہیں یاد رکھتی وہ خود کبھی ایسا کام نہیں کرے گی جو آیندہ یاد رکھے جانے کے قابل ہو۔ لیکن محض قومیت کی عینک کو اُتار کر اگر آپ تاریخ کو فلسفی کی نگاہ سے دیکھیں تب بھی آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ تمدن کا تسلسل قومی ترقی کے لیئے اس اصول کو منضبط کرتا ہے کہ کسی قوم کی پچھلی تاریخ اُسکے عروج اور زوال کے اسباب اُسکی فطرتی قوتوں اور اُسکے مرزبوم کے حالات۔ اُس قوم کی آئندہ روش پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ آجکل کے نوجوانوں کے لیے جنہیں ہندوستانی قوم کو از سر نو خلق کرنا ہے نہایت ضروری خیال کرتے ہیں۔

مسٹر دت کی تاریخ ہندوستان قدیم ہمارے ملک میں اُنیسویں صدی کی نامآور کتابوں میں سے ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جہاں تک محض واقعات کی تحقیقات کا تعلق ہے۔ اس کتاب میں بہت کچھ کمی ہے اگر وہی کتاب مسٹر دت آج لکھتے تو وہ موجودہ مستشرقین کی تحقیق اور تنقید سے ضرور فائدہ اُٹھاتے۔ اس خیال سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسٹر ونسنٹ اسمتھ، پروفیسر رائیس ڈیوس کی کتابیں مسٹر دت کی

تصنیف کے مقابلہ میں زیادہ معتبر ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اسکے ہمکو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ مسٹر دت نے مسٹر اسمتھ کی طرح واقعات بیان کردینے پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ اُنسے نتائج بھی اخذ کئے ہیں اُنکی کتاب محض تاریخی روزنامچہ نہیں ہے بلکہ ہندو تمدن کی داستان ہے اور چونکہ وہ خود ہندو تھے اور اس تمدن کی خوبیوں اور کمزوریوں سے بخوبی واقف تھے اسلئے باوجود تحقیقات کے نقائص کے جو کچھ اُنھوں نے ہندو تمدن کے متعلق لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ توجہ سے پڑھا جائے اور غور و فکر کی کسوٹی پر کسا جائے۔

مسٹر اے۔ ڈی۔ احمد صاحب نے مسٹر دت کی کتاب کے پہلے دور یعنی ویدک زمانہ کی تاریخ کا ترجمہ کیا ہے اور کتاب کے باقی حصص کا ترجمہ کرنے کا آخر میں وعدہ فرمایا ہے۔ علاوہ ترجمہ کے آپ نے کتاب کے شروع میں ایک طویل مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جس میں قدیم داستانوں کے فوائد، مذہب اور تمدن کے تعلق۔ تاریخی تنقید کے اصول اور اسی قسم کے دیگر مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ ازاں بعد وید سنسکرت کا علم ادب اور فلسفہ ویدانت۔ ہندوستان قدیم کے فنون نفیسہ وغیرہ کے کچھ حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اسکے بعد مسٹر دت کی سوانح عمری درج ہے۔

نئی روشنی کے دلدادہ غالباً یہ کہیں گے کہ اتنا بڑا مقدمہ کسی تاریخی تصنیف کے لئے ناموزوں ہے کیونکہ اسمیں اکثر انھیں باتوں کو دُہرایا گیا ہے جنپر مسٹر دت نے اپنی کتاب میں بحث کی ہے اور جب ہمکو کتاب کا ترجمہ پڑھنا ہے تو ان باتوں کے اعادہ کی مقدمہ کی شکل میں [illegible]

تھی۔ ترجمہ میں زبان کی لطافت بہت کچھ موجود ہے لیکن کہیں کہیں پُرانی انشاپردازی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ذیل کے فقرے ملاحظہ ہوں:

"ابتدائی زمانے کی قدیم روایتوں اور قومی تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ بالکل اس زمانہ کی ضد واقع ہُوا تھا اُسمیں نہ تہذیب تھی نہ شائستگی تھی نہ تمدن کی ترقی تھی نہ تعیش کا دَور تھا نہ ایسے اسباب راحت موجود تھے نہ ایسے سامان فرحت مہیا تھے نہ اس طرح کی معاشرت تھی نہ اس نہج کی منافرت تھی نہ یہ حرفت وصنعت کی گرم بازاری تھی نہ یہ زراعت وتجارت کی بھرمار تھی نہ کوئی نظام درست تھا نہ کوئی اسلوب صحیح تھا نہ کہیں ایسی منتظم بادشاہت تھی نہ کہیں ایسی باقاعدہ حکومت تھی نہ ایسے دستور رائج تھے نہ ایسے اصول قائم تھے نہ کسی قسم کا قانون نافذ تھا نہ کسی نوع کا آئین شائع تھا نہ یہ خلش تھی نہ یہ روش تھی نہ ایسا تکلف تھا نہ ایسا تصنع تھا نہ اس طرح کا علم ادب دیکھنے میں آتا تھا نہ اس قطع کا فلسفہ پایا جاتا تھا نہ کسی ذات کی قید تھی نہ کسی رسم کی پابندی تھی نہ اس حیثیت کی آرائش تھی نہ اس کیفیت کی نمائش تھی نہ یہ آفتاب آفتاب سمجھکر پوجا جاتا تھا نہ یہ ماہتاب ماہتاب جانکر مانا جاتا تھا غرضکہ نہ یہ زمین زمین تھی نہ یہ آسمان آسمان تھا۔"

"جب ہمارا تصور ہم کو ابتدائی دُنیا کی سیر کراتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں کہیں خدا کی سادگی پسند مخلوق آباد ہے جنمیں نہ حد سے بڑھا ہوا تعصب ہے نہ مقدار سے زیادہ

تشخص ہے نہ افراط ہے نہ تفریط ہے نہ تعمیم ہے نہ تخصیص ہے
نہ پیکار غلو ہے نہ فضول علو ہے نہ تساہل ہے نہ تغافل ہے
نہ اندوہ ہے نہ یاس ہے نہ جسارت ہے نہ ہراس ہے نہ بغض
عداوت ہے نہ بے سبب نفرت ہے نہ حقارت ہے نہ شماتت
ہے نہ کراہت ہے نہ اہانت ہے نہ کہیں بڑھی ہوئی حاجتمندی
ہے نہ کہیں گھٹی ہوئی حوصلہ مندی ہے ......"

اِس کتاب کی ریویو میں ہم ایک امر کا ذکر کرنا نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ ہندوؤں کی قدیم تمدن کی داستان کا ایک مسلمان مترجم کے ہاتھوں اس زمانہ میں ترجمہ ہونا جبکہ ایک طرف مسلمان لیگ کا دَور دَورہ ہے اور دوسری طرف ہندو کانفرنس کی اشاعت ہو رہی ہے ایک مسرت انگیز اور تعجب خیز واقعہ ہے۔ مترجم صاحب کو انکی علمی کوشش اور انکی بے تعصبی پر مبارکباد دیتے ہیں اور جس عزت کے ساتھ اُنہوں نے ہندو بزرگوں کا نام لیا ہے اور جس طریق پر اُنھوں نے ہندو مذہب اور ہندو فلسفہ کے خوبیوں کی قدر دانی کی ہے اُسکو ہر مذہب اور ملت کے لوگوں کے لئے قابل تقلید سمجھتے ہیں۔ یہ کتاب محمد فدا علی خاں صاحب سکریٹری ٹرینسلیٹنگ کمیٹی گھاٹ دروازہ جے پور سے مل سکتی ہے۔

منوہر لال زتشی

خوفِ رسوائی

(۱)

ایک آراستہ و پیراستہ کمرہ میں ایک نازک اندام نفیس پوش عورت میز کے سامنے رخساروں پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہے۔ وہ کسی گہرے خیال میں غرق ہے۔ مگر ظاہراً اس خیال میں غور کی محویت نہیں ہے۔ بلکہ بے چینی اور انتشار۔ اضطراب اور گھبراہٹ کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہیں۔

سرلا۔ بابو دھرن چودھری کی بیوی تھی۔ دھرن کلکتہ کے ایک نوجوان بیرسٹر تھے۔ خلیق اور غریب نواز۔ فیشنیبل سوسائٹی سے محترز رہنے والے نہ بال سے رغبت۔ نہ گھوڑدوڑ کے شیدا۔ وہ تھیٹروں اور پولٹیکل جلسوں میں بہت کم شریک ہوتے۔ ان کی اوقات کا بیشتر حصہ اپنے مقدمات کی تحقیق و تدقیق میں صرف ہوتا تھا۔ ان کے دوستوں کا حلقہ نہایت محدود تھا۔ جہاں تکلف اور ظاہرداری کے بدلے خلوص اور دوستی کے مراسم برتے جاتے تھے۔ دھرن کو فیشن سے انتہا درجہ کی نفرت تھی۔ باوجود اس کے کہ کلکتہ کا ہر ایک گوشہ پولٹیکل خبروں سے گونج رہا تھا۔ مگر دھرن کو اُنسے صرف اتنی ہمدردی کہ اخباروں میں اُن کا تذکرہ دیکھ لیا کرتا۔ پولٹیکس سے اُسے مناسبت نہ تھی وہ اپنے دوستوں میں ایک سیدھا سادھا سلیم الطبع صلح پسند۔ میانہ رو۔ خوش باش آدمی مشہور تھا اس کے برعکس سرلا فیشنیبل عقائد کی عورت تھی۔ اُس نے اعلیٰ درجہ کی

انگریزی تعلیم پائی تھی، اور ہندوستان کے پولیٹیکل اور اقتصادی معاملات سے اُسے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ ایک بار وہ اپنے کالج کی لیڈی پرنسپل سے صرف اس بنا پر جھگڑ پڑی کہ لیڈی صاحبہ نے برسبیل تذکرہ ہندوستانی عورات کے متعلق زبان سے کچھ اہانت آمیز کلمات نکالے تھے۔ آزادی نسواں کے متعلق بھی اس کے خیالات بہت وسیع تھے۔ باوجود ان اسباب کے وہ ہندوستانی محبت اور جذبات کی عورت تھی۔ وضع کی پابند شوہر کی ادب اور محبت کرنے والی۔

سرلا سوچتی تھی "کیا یہ ممکن ہے؟" انھیں ان معاملات سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ یہ سب کسی بدخواہ کی شرارت ہے کسی سیہ باطن شخص نے یہ دروغ اختراع کیا ہے۔ ایسا ہرگز ممکن نہیں۔"

(۲)

حقیقت یہ تھی کہ آج پولیس سپرنٹنڈنٹ نے کئی کانسٹبلوں کے ساتھ دھرن بابو کے مکان کی تلاشی لی تھی بنگل کے روز چار بجے شام کو ہیریسن روڈ کے کنارے ایک نوجوان بنگالی نے ایک انگریز افسر پر بم کا گولہ چلایا تھا۔ اس ہولناک حادثہ نے سارے شہر میں کھلبلی ڈالدی تھی۔ خانہ تلاشیوں کی گرم بازاری تھی۔ اور سب سے اچنبھے کی بات یہ تھی کہ دھرن بابو پر اس قتل کی اعانت کرنے کا جرم لگایا گیا تھا جو شخص سنتا اُسے حیرت ہوتی۔ دھرن بابو! نہیں۔ وہ ہرگز ایسے معاملوں میں شریک نہیں ہو سکتے! وہ ایسے سیدھے سادے۔ سلامت پسند۔ اپنے کام میں شب و روز محو رہنے والے آدمی تھے کہ کسی کو اُن کے متعلق ایسی متوحش خبر سُن کر اعتبار نہیں آتا تھا اور دھرن بابو پر یہ

شبہ محض ایک مخبر کے بیان کی بدولت عائد ہوا تھا۔ مخبر نے صاف صاف کہا تھا کہ منگل کو چار بجے دھرن بابو ہیریس روڈ پر موجود تھے۔ اور اُنہوں نے قاتل کو اپنے ہاتھ سے بم کا گولہ دیا تھا۔ اسی بیان کی بدولت آج دھرن بابو کی خانہ تلاشی ہوئی۔ صندوق۔ الماریاں۔ کاغذات، خطوط ایک بھی تفتیش کنندہ افسر کی متجسس نگاہوں سے نہ بچا۔ اور باوجودیکہ کوئی ثبوت ایسا نہ ملا جس سے دھر بابو پر اعانت جرم کے شبہ کی تائید ہوسکے۔ تاہم سپرنٹنڈنٹ نے انھیں زیر حراست لے لیا۔ سرلا انھیں پریشان کرنے والے واقعات کے اثر سے اس وقت بے چین ہے

وہ خیال کرتی تھی "ضرور سپرنٹنڈنٹ پولیس سے غلطی ہوئی اُس نے دھوکا کھایا۔ منگل کو چار بجے دھرن عدالت میں ہوں گے، عدالت سے اس کا ثبوت ملسکتا ہے۔ اُن کے موکل اور احباب اسکی تصدیق کرسکتے ہیں۔ مگر دھرن نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے روبرو اپنی بریت کا ثبوت کیوں نہ دے دیا۔ ممکن ہے اس وقت گھبراہٹ میں انھیں خیال نہ رہا ہو۔ اب ضرور انھوں نے صفائی کرلی ہوگی اور غالباً آتے بھی ہوں گے"

ان خیالات سے سرلا کا دل ذرا ہلکا ہوا۔ اسی اثنار میں ایک موٹر کار دروازہ پر آکر رُکی۔ سرلا کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ وہ مسرت سے بیتاب ہوکر زینہ سے نیچے اُتری۔ موٹر گھر ہی کا تھا۔ مگر اس میں دھرن بابو کے بجائے جوتندر روشن بیٹھے ہوئے تھے۔ جو دھرن کے دلی دوستوں میں تھے۔

سرلا نے پوچھا "دھرن کہاں ہیں۔ دیکھا پولیس والوں نے کیسی

حماقت کی ہے۔ تم جانتے منگل کے دن شام کے وقت وہ ہائی کورٹ میں تھے۔ کیوں صفائی ہوگئی نہ کب تک آئیں گے ؟ تم اُن سے ملے تھے"

جوتندرو کے چہرے نے سرلا کے خیال کی تائید نہیں کی۔ وہ فکرمند اور دردناک نگاہوں سے سرلا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سرلا نے گھبرا کر کہا "جوتن تم اس قدر پریشان کیوں ہو صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔"

جوتن نے کچھ سوچ کر جواب دیا "شاید دھرن آج شب کو نہ آسکیں ممکن ہے کچھ توقف ہو۔ جونہی ان کی صفائی ہوگی، غالباً ان کا تم سے ملنا ضروری ہے۔ میں خیال کرتا ہوں ...." یہ کہتے کہتے جوتن بابو رک گئے۔ سرلا تاڑ گئی کہ یہ کوئی منحوس خبر لائے ہیں۔ گھبرا کر بولی۔ "جوتن! مجھ سے اس وقت پہیلیاں مت بجھواؤ۔ جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہو۔ مجھ میں اب برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ کیا دھرن ابھی رہا نہ ہوسکیں گے کیا انھوں نے اپنے بریت کے ثبوت میں یہ نہیں کہا کہ وہ منگل کو چار بجے عدالت میں تھے۔ میرے خیال میں یہ تو بہت کافی ثبوت تھا"

جوتندرو نے لمبی سانس لیکر کہا "منگل کے دن سہ پہر کو وہ عدالت میں نہیں تھے"

سرلا "کیا! عدالت میں نہیں تھے۔ آخر تب کہاں تھے ؟ جوتندرو "یہی تو وہ بتلاتے نہیں"

سرلا "کیوں آخر وجہ ؟ کیا آپ ہی اپنے دشمن ہوئے ہیں۔؟

جوتندرو "وہ مطلق کچھ نہیں ظاہر کرتے۔ عدالت میں ان کے ۲ بجے

تک رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک کرایہ کی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں گئے۔ مگر کہاں گئے اور ۴ بجے سے ۶ بجے تک کہاں رہے۔ اس کا وہ کچھ بھی پتہ نہیں دیتے"۔

سرلا نے عالم وحشت میں سر کو ہاتھوں سے تھام کر کہا: "میری عقل کچھ کام نہیں کرتی۔ دھرن کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ اس سازش میں شریک ہوں۔ اگر وہ خود اپنی زبان سے کہیں تب بھی مجھے اعتبار نہیں آسکتا۔ مگر وہ صاف صاف حقیقت حال کیوں نہیں کہتے۔ کیا تم لوگوں نے انھیں سمجھایا نہیں"؟

جوتندر و "سمجھایا کیوں نہیں۔ گھنٹوں بیٹھے سر مغزی کرتے رہے۔ مگر جب کچھ ان کے خیال میں آئے۔ اور وہ ایسے کم فہم نہیں ہیں کہ ہم کو اُن کے سمجھانے کی ضرورت ہو۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ ایسے نازک موقع پر اُن کا کچھ صاف صاف نہ کہنا کیسے خطرناک نتائج پیدا کرے گا۔ مگر اس وقت وہ کسی کی نہیں سنتے۔ کہتے ہیں بلا سے میں چند سالوں کے لئے جلا وطن ہو جاؤں گا۔ جلا وطنی اور قید جھیلنے کے لئے آمادہ ہیں مگر نشل کو کہاں تھے۔ یہ نہیں بتاتے۔ اس لئے میں تمہارے پاس آیا ہوں کہ شاید کچھ تمہیں معلوم ہو۔ کچھ معلوم ہے؟ وہ زیادہ تر کہاں آتے جاتے ہیں"؟

سرلا نے سر ہلا کر جواب دیا: "میں نے انھیں کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ میں تو اب تک اسی خیال سے خوش تھی کہ نشل کو چار بجے وہ ضرور کچہری میں رہے ہوں گے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ آخر وہ کیوں خاموش ہیں۔ کیا سمجھے ہوئے ہیں۔ ذرا مجھے اُن کے پاس لے چلو۔ شاید

وہ سب مجھ سے کچھ اپنے دل کی بات کہیں. ضرور کہیں گے. میں اُنھیں سمجھاؤں گی۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کی زبان سے حقیقت حال سُن لوں گی۔ وہ میری درخواست کو رد نہیں کر سکتے۔ بس مجھے اُن کے پاس لے چلو۔

سرلا کا گلا بھر آیا۔ جوتندر تسکین دہ لہجہ میں بولے "میرا بھی یہی خیال ہے کہ شاید تم کو وہ کچھ بتلائیں۔ اسی لئے میں تمہارے پاس آیا تھا۔ مگر اب رات زیادہ آگئی ہے۔ اور اس وقت اُن سے ملاقات کرنے کی کوشش فضول ہے۔ مجسٹریٹ کی اجازت ملنی مشکل ہوگی۔ میں کل تمہیں وہاں لے چلوں گا۔ ایشور نے چاہا تو سب اچھا ہی ہوگا۔ ہائیں۔ یہ کیا۔ دل کو ڈھارس دو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے"

سرلا کی آنکھوں میں اشک اُمڈے ہوئے تھے۔ مگر اُس نے ضبط کیا اور جوتن سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی "جوتن۔ تمہاری ان عنایتوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میری زبان میں الفاظ نہیں ہیں۔ مگر میں انھیں فراموش نہیں کر سکتی"

سرلا کی آواز بھر رک گئی۔ وہ کیسی خوش خوش زینے سے اتری تھی دھرن کی واپسی کی امید نے اُس کے چہرہ کو روشن کر دیا تھا۔ مگر اب اس پر حسرت و یاس کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ جوتن بابو آہستہ آہستہ فکرمند کمرہ سے باہر چلے گئے۔ وہ سوچتے جاتے تھے "غریب! ابھی اُسے کیا خبر کہ کیا بیتنے والی ہے۔ کاش وہ ظالم اپنی زبان سے کچھ کہہ دیتا۔ مگر تب بھی عجیب گومگو معاملہ ہے"

(۳)

دس بج گئے تھے۔ سرلا نے کچھ نہیں کھایا۔ نوا سے منہ سے باہر

نکلے آتے تھے۔ وہ پلنگ پر گئی۔ مگر نیند نہ آتی تھی۔ میز کے سامنے اخبار لے کر بیٹھی۔ مگر اخبار ہاتھ میں تھا اور آنکھیں کھڑکی طرف تب وہ اٹھکر ٹہلنے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت دھرن کے پاس چلوں چلکر مجسٹریٹ سے کہوں کہ مجھے اُن سے ملاقات کرنے دو۔ کب وہ انکار کرے گا؟

ہاے۔ دھرن اس وقت کیا کرتے ہوں گے۔ کاش میں اُنکے پہلو میں ہوتی۔ کیا وہ مجھ سے بھی اپنے دل کا حال چھپائیں گے۔ کیا اس وقت انھیں میرا خیال ہوگا۔ کبھی کبھی اس کا دل جھنجلا اُٹھتا اور وہ اپنے شوہر کو بے رحم خیال کرتی۔ کیا انھیں خبر نہیں کہ میں کس قدر بے چین ہوں اتنے دنوں تک ساتھ رہنے پر بھی انھیں میرے دل کا، اور میری محبت کا اندازہ نہوا۔ وہ کیوں خاموش ہیں۔ آخر کیوں۔

ٹہلتے ٹہلتے اُس کی نگاہ دھربندرو کی میز پر پڑی۔ خطوط۔ کاغذات اخبارات اوراق پریشان کی طرح بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ سرلا اضطراری طور پر بیٹھ گئی۔ اور انھیں سمیٹنے لگی۔ یکایک اس کی نگاہ ایک کاغذ کے ٹکڑے پر پڑی جو میز کے نیچے گرا ہوا تھا۔ اس نے چاہا کہ اسے اٹھاکر دوسرے خطوط کے ساتھ رکھ دے مگر اس پرزے پر چند ایسے الفاظ نظر آئے جو خود بخود اُسکی آنکھوں میں چبھ گئے۔ یہ وہ الفاظ تھے جن کے پردہ میں اس کی پریشانیوں کا راز پوشیدہ تھا۔ ”منگل کے دن ۱۰ بجے“ سرلا چونک پڑی۔ اُس پرزے کو اٹھایا منگل کے دن ۱۰ بجے ہی کا تو یہ واقعہ ہے۔ اُس نے اِن الفاظ کو پھر غور سے دیکھا کیا اس پرزہ کو ان واقعات سے کوئی تعلق ہے۔ کیوں میں نہ اُسے

پڑھوں۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا۔ انداز تحریر سے بھی وہ مانوس معلوم ہوتی تھی۔ مگر خط کو پڑھوں؟ سراپا وجود دیکہ شوہر کو دل وجان سے چاہتی تھی۔ لیکن انگریزی تعلیم کے اثر نے اُس کے ذہن میں یہ خیال قایم کردیا تھا کہ مجھے اپنے شوہر کے پوشیدہ خطوط پڑھنے کا کوئی مجاز نہیں ہے کیا اس خط کو پڑھ لوں تو وہ مجھسے ناراض ہوں گے یقیناً اس سے ان معاملات پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑے گی اس میں کوئی ایسی بات ہرگز نہیں ہوسکتی جو وہ مجھ سے چھپانا چاہتے ہوں۔ بالفرض اس میں کوئی مخفی بات ہی ہو تاہم میں اس وقت اسے پڑھنے کی مستحق ہوں۔ تہذیب جدید کی یہ قیدیں ایسے نازک موقعوں پر عمل میں نہیں آسکتیں۔ کیا مجھے اُن کے راز دار بننے کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔ میں ثابت کردوں گی کہ میرے دل میں بھی باتیں اسی طرح محفوظ رہ سکتی ہیں جس طرح اُن کے دل میں۔

اس نے خط کھولکر دیکھا۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا۔ سرلا ایک ہی نگاہ میں اُسے پڑھ گئی۔ اور اُسے ایسا معلوم ہوا گویا میرے بدن میں جان نہیں ہے۔ وہ پتھر کی مورت کی طرح بے حس و حرکت ہوگئی۔ اس کی انگلیوں کے بیچ میں کاغذ کا وہ پرزہ ہوا کے جھوکوں سے ہل رہا تھا اور اس کی آنکھیں دیوار کی طرف گڑی ہوئی تھیں۔ اُس کا چہرہ خاک کی طرح زرد ہوگیا تھا۔ عضوِ مفلوج کی طرح اس کے دل و دماغ اس وقت بیکار ہوگئے تھے خط کا مضمون بھی خیال میں نہیں آتا تھا۔ وہ بہت دیر تک اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ یکایک اُس کی نگاہوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ اور ساری کیفیت نظروں کے سامنے

صورت پذیر ہوگئی۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور کرسی پر گر پڑی
آہ اس خموشی کے یہ معنی ہیں! اسی لیے زبان پر مہر لگی ہوئی ہے"
"خیر۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے" سرلا سوچنے لگی۔

بیشک یہ خط دھرن کو اس الزام سے بری کردے گا۔ جو اُن پر عائد ہے۔ کسی اہتمام کی ضرورت نہیں۔ میں اسے مجسٹریٹ کے سامنے رکھ دوں گی۔ ذرا سی تحقیقات میں سارے واقعات کھل پڑیں گے۔ اور دھرن فوراً رہا ہو جائیں گے۔ لیکن اُس کے بعد۔ پھر کیسے نبھیگی! کیا اس کے بعد بھی ہم ایک دوسرے کی محبت کر سکیں گے۔!"

اسے پھر خیال آیا۔ کیا یہ مناسب ہے کہ میں اس راز کو اس طرح طشت ازبام کردوں جن کے مخفی رکھنے کے لئے دھرن یہ سب کچھ جھیلنے کو تیار تھے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ میں خموشی اختیار کروں۔ اور انھیں اس الزام کا خمیازہ اٹھانے دوں جس سے وہ بالکل پاک ہیں۔ انھیں بچانا میرا فرض ہے۔ آخر اُس کے دل نے فیصلہ کرلیا۔ وہ کھڑکی کی طرف گئی۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ پھر اپنے کمرہ میں آکر ایک چادر اوڑھ کر باہر نکل پڑی۔ نوکر چاکر سب سو گئے تھے۔ گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی نے اُسے باہر جاتے نہیں دیکھا۔

سرلا قدم بڑھاتے ہوئے تھوڑی دیر میں ایک خوبصورت مکان کے سامنے آکر رکی کمرہ میں لیمپ جل رہا تھا۔ اور ایک عورت میز پر بیٹھی ہوئی کچھ لکھتی دکھائی دیتی تھی۔ سرلا کو دیکھتے ہی اُس عورت نے گھبرا کر پوچھا "سرلا! تم یہاں کہاں؟ اتنی رات گئے۔ کیا معاملہ ہے۔ کیا دھرن بیمار تو نہیں ہیں؟"

سرلا نے میز کے سامنے آکر کہا "کیا تم نے نہیں سُنا کہ دھرن پر حادثہ بم میں شریک ہونے کا جرم عائد ہوا ہے۔ مخبر کا بیان ہے کہ جس وقت قاتل کے ہاتھ میں بم دیا گیا اُس وقت دھرن وہاں موجود تھے۔ یہ منگل کے چار بجے دن کا واقعہ ہے دھرن کا بیان ہے کہ مجھے ان سانحات کا مطلق علم نہیں۔ اور نہ اُس وقت میں وہاں تھا لیکن یہ وہ نہیں بتاتے کہ اُس وقت تھے کہاں۔ میں تم سے پوچھتی ہوں منگل کے دن چار بجے شام کو وہ کہاں تھے؟

وہ عورت چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی "منگل کو چار بجے! اُس دن تو وہ...." کچھ کہتے کہتے رُک گئی اور بہت مدھم لہجہ میں بولی "وہ کیوں وہ کچھ بتاتے نہیں کیا۔ سوا کچہری کے اور کہاں ہوں گے"

سرلا نے جواب دیا "نہیں اُس دن وہ عدالت میں نہیں تھے" مگر ضبط ہاتھ سے جاتا رہا۔ اُبل پڑی "اور اس معاملہ میں وہ اس لئے خاموش ہیں کہ شاید اظہار حال کسی کے نام نیک پر دھبہ نہ لگا دے اب میرے سامنے ایسی بھولی نہ بنو۔ میں سب جان گئی ہوں۔ ہاں مجھ سب کچھ معلوم ہو گیا ہے، یہ دیکھو" یہ کہکر اس نے وہی خط میز پر پھینکدیا اس عورت نے لپک خط اُٹھا لیا۔ اور اس پر اُڑتی ہوئی نگاہ ڈالکر کسی قدر بیباکانہ لہجہ میں بولی "ہاں مجھے کسی کا خوف نہیں ہے بیشک دھرن کو مجھ سے محبت ہے۔ آج سے نہیں بہت دنوں سے"

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہیں۔ تب سرلا نے تحکمانہ انداز سے کہا "تو انھیں بچا کیوں نہیں لیتیں۔ اس خط کو مجسٹریٹ کے پاس بھیجدو۔ اور دھرن فوراً چھوٹ جائیں گے" یہ کہکر وہ لوٹ پڑی۔ اور

اور اپنے خانۂ محزوں میں چلی آئی۔

تڑاکا ہو گیا تھا۔ اور سرلا کی آنکھیں ابھی نہیں جھپکی تھیں۔ اسے اب دھرن کی رہائی کی فکر نہ تھی اس فکر سے اب وہ آزاد ہو گئی تھی۔ مگر جن فکروں نے اس وقت اسے گھیر رکھا تھا وہ اس سے بھی زیادہ جانکاہ تھیں۔

"د تھوڑی دیر میں وہ یہاں آتے ہوں گے مجھ سے ملاقات ہوگی کیا میں ان سے مل سکوں گی؟ اب میں کس دعوے پر، کس برتے پر، اُن سے ملوں گی۔ جب یہ میں جانتی ہوں کہ انھیں مجھ سے نہ کبھی محبت تھی اور نہ ہے تو میں کو نسا منہ لیکر ان کے سامنے جاؤنگی۔ جب تک میں الفت کا خواب دیکھ رہی تھی مجھے اُن پر اعتبار تھا۔ مگر اب! آہ اب میرے لئے زندگی میں کیا امید ہے میرا دل۔ میری جان میری آرزوئیں۔ میری زندگی کی خوشیاں سب ان کی ذات سے وابستہ تھیں۔ محبت سے عورت کا سہاگ قائم ہے۔ میرا سہاگ اب کہاں"؟

سرلا کی آنکھیں کھڑکی کے باہر سبزہ زار کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ گویا وہ مستقبل کے وسیع میدان میں قدم بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ اُس کے دماغ میں اب احساس کا مادّہ نہ رہا تھا۔ بھوک اور پیاس۔ نیند اور تکان۔ یہ چیزیں اسے بالکل محسوس نہ ہوتی تھیں بسست رفتار دن چڑھتا جاتا تھا اور سرلا وہیں کھڑکی سامنے انھی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دھرن کی اب تک کچھ خبر نہ تھی۔ مگر سرلا کو اس کی زیادہ تشویش نہ تھی۔ وہ اپنے شوہر کو ہمیشہ ایک حلیم اور متین شخص سمجھتی رہی۔ اُس نے بارہا اُن سے اُن کی بے نمکی اور بے اعتنائی کی شکایت کی تھی۔ مگر اس خیال سے اس کے دل کو تسکین ہو گئی تھی کہ ان کی طبیعت ہی ایسی متین واقع ہوئی ہے۔ وہ

سمجھتی تھی کہ وہ طبعاً اظہار جذبات سے محترز رہتے ہیں۔ وہ اس کی طرف سے ہمیشہ بے تعلق سے رہتے تھے۔ کچھ پروا نہیں تھی کہ وہ کہاں جاتی ہے۔ کیسے رہتی ہے۔ کن چیزوں کا شوق ہے ایسا شاذ ہی کبھی اتفاق ہوا تھا کہ وہ دُرگا پوجا کے دن سرلا کے لئے کوئی تحفہ لائے ہوں۔ سرلا سمجھتی تھی کہ مقدمات کی مصروفیت ان بے اعتنائیوں کا باعث ہے۔ اسے یقین تھا کہ گو ظاہر نہ سہی۔ مگر دل سے وہ میری محبت کرتے ہیں۔ مگر اب ان سرد مہریوں کا راز سمجھ میں آگیا۔ وہ اب دوسری عورت کے دام محبت میں گرفتار ہیں۔ جب محبت کا رشتہ نہ رہا تو تمدنی رشتہ کس کام کا مگر باوجود ان سرد مہریوں کے وہ شوہر کی محبت میں مخمور تھی۔ اُس نے انھیں اپنے دل میں جگہ دیدی تھی اور اب کسی طرح ہٹا نہیں سکتی تھی۔ خواہ وہ محبت اُس کے لئے سوہان روح ہی کیوں نہ ہو۔ بیشک یہ خیالات حسد اور جلن کے سبب پیدا ہوئے تھے۔ مگر حسد کی تیزی اور جانکاہی محبت کی کسوٹی ہے۔

بہت دیر تک سوچنے کے بعد سرلا اِس نتیجہ پر پہنچی "میں اب ان کا دامن چھوڑ دوں گی۔ اس کے سوا میرے لئے اب اور کوئی تدبیر نہیں ہے میں نے اب تک نادانستہ انھیں قید جبر میں رکھا ہے اب میں انھیں چھوڑ دوں گی۔ اُن کا گلا چھوٹ جائے گا۔ اُنکی زندگی آرام سے گذرے گی۔ ایشور کرے وہ ہمیشہ خوش رہیں سرسبز ہوں۔ انھیں خوش دیکھکر میں بھی خوش ہولیا کروں گی"!

انھیں خیالات میں دس بج گئے۔ سرلا اب تک وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ یکایک ایک گاڑی کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔ اس نے کھڑکی سے

جھانک کر دیکھا۔ دھرن بیٹھے ہوئے تھے۔ سرلا کا کلیجہ دھڑکنے لگا مگر وہ بے جان لاش کی طرح بیٹھی رہی۔ زینہ پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور ذرا دیر میں دھرن کمرہ میں داخل ہوئے۔ سرلا اب بھی کچھ نہ بولی۔ اُسے الفاظ ہی نہ ملے دھرن نے اُس کے پاس آکر آغوشِ محبت میں لینا چاہا۔ اور بولے "کیوں سرلا تم میری خاطر بہت پریشان تھیں" مگر سرلا نے مُنہ پھیر لیا اور ہٹ گئی۔ دھرن نے کچھ خیال نہ کیا کہنے لگے "پولیس والوں نے کیسی حماقت کی۔ خیر جو کچھ ہوا۔ وہ ہوا کسی طرح خانہ عافیت میں تو پہنچے۔ رات بھر مصیبت میں مبتلا رہا"

سرلا خاموش اُن کے چہرہ کی طرف تاکتی رہی کیسی مکر کی باتیں ہیں۔ دھرن کے برتاؤ میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہی بے تکلفی وہی آزادی۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ سرلا زیادہ متحمل نہ ہو سکی۔ ترش لہجہ میں بولی "تم یہاں کیوں آئے؟" دھرن نے تعجب آمیز لہجہ میں کہا "سرلا یہ کیسی باتیں کرتی ہو اپنے گھر کے سوا اور کہاں جاتا۔ تم میرے آنے سے خوش نہیں معلوم ہوتیں۔ کیوں کیا بات ہوئی؟"

سرلا "ابھی اُس سے ملاقات کی یا نہیں۔؟"

دھرن "کس سے؟ تمہارا مطلب میں نہیں سمجھا"

سرلا "دھرن۔ اب یہ تجاہل مت جتاؤ۔ اب حیلہ سازیوں کا موقع نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم میں صفائی کے ساتھ گفتگو ہو جائے۔ مجھ پر تمہاری ساری باتیں روشن ہو گئیں ہیں۔ ایک خط میری نظر سے گذر چکا ہے جو مجھے میز کے نیچے گرا ہوا ملا۔ یہ خط میں نے تمہاری معشوقہ کو دکھایا۔ اور غالباً اس نے اسے مجسٹریٹ کے یہاں پیش کر دیا اس لیئے اب مجھ سے دغل

فصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری خوشی میں مخل نہیں ہونا چاہتی۔ میں تمہیں شوق سے لطف زندگی اُٹھانے کے لئے آزادی دیتی ہوں سب مجھے افسوس ہے کہ یہ باتیں مجھے اور پہلے کیوں نہ معلوم ہوگئیں ورنہ تمہیں اتنے عرصہ تک قید بے جا میں نہ رہنا پڑتا"

دمبرن بغلیں جھانکنے لگا۔ آخر راز طشت از بام ہوگیا میں نے کیا حماقت کی کہ خط کو چاک نہ کر دیا۔ اس نے وہ خط مجسٹریٹ کے یہاں دیکھا تھا۔ اور حافظہ پر بار بار زور ڈالتا تھا کہ کیونکر یہ وہاں پہنچا۔ مگر یاد نے کچھ کام نہ دیا تھا۔ اب حقیقت معلوم ہوئی۔ اور وہ اپنے اوپر جھنجلایا مگر سرلا کی خوشامد کرنے لگا: "میری جان! میں سخت نادم ہوں۔ واقعی مجھے سخت ندامت ہے۔ مگر کیا تم میری اس خطا کو معاف نہیں کر سکتیں اگر کسی کے کان میں اس کی ذرا بھی بھنک پڑ گئی تو میری خیر نہیں۔ ابھی تک یہ بھید چھپا ہوا ہے۔ مجسٹریٹ بڑا دانا شخص ہے۔ اُس نے خط کو دیکھ کر مجھے نور رہا کر دیا۔ مگر اُسے عدالت میں پیش نہیں کیا۔ ابھی تک یہ راز سربستہ ہے مگر تم خوب جانتی ہو کہ لوگوں کو ایسی باتوں کی کیونکر تلاش رہتی ہے پبلک کو دوسروں کی رسوائی و بدنامی میں مزہ آتا ہے۔ میری خاطر سے تم اس تذکرے کو زبان پر نہ لاؤ غلطیاں انسان سے ہوتی ہی ہیں۔ اگر تم اسی میں خوش ہو تو حلفیہ کہتا ہوں کہ اب کبھی اُس کے دروازہ پر نہ جاؤں گا"

سرلا "کیوں تم اُس پر عاشق نہیں ہو؟ اس کی آبرو کے خوف سے تم قید اور جلاوطنی جھیلنے پر آمادہ تھے۔ اور اب تم کہتے ہو میں اُس کے دروازے پر نہ جاؤں گا۔ کیا اتنی جلد دل سے نقش محبت مٹ گیا۔! ان فریب کی باتوں سے مجھے کچھ حاصل نہیں۔ تم شوق سے خوشیاں مناؤ۔ میں

ذرا بھی مخل نہوں گی۔ حسد کا کانٹا بنکر کسی کے پہلو میں کھٹکنا نہیں چاہتی"

دھرن کرسی پر بیٹھ گئے اور غمناک لہجہ میں بولے بعد سرلا! ایسی باتیں بالکل بے موقع اور بے ضرورت ہیں۔ جب تم دکھتی ہو کر میں حد درجہ نادم اور پشیمان ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اب اس سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔ تو تمھیں ایسی باتیں کر کے میرا دل نہیں دکھانا چاہیئے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ ان باتوں کو پوشیدہ رکھنے کے لئے میں کس حد تک نقصانات اٹھانے کے لئے تیار تھا۔ اگرچہ میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مگر مجھے جلا وطن ہونا گوارا تھا بجائے اس کے کہ منگل کے دن اپنے حرکات کا پتہ دوں۔ اب تک طرح طرح کی افواہیں اڑتی ہوتیں۔ یقین مانو اس رسوائی کے مقابلہ میں میں جلا وطن ہونا بہتر سمجھتا ہوں۔

سرلا: "اگر راہِ محبت میں قدم رکھا ہے تو رسوائی کا کیا خوف! اگر تمہاری محبت سچی ہے تو تمہیں سوسائٹی کا اِس قدر خوف نہ کرنا چاہیئے"

دھرن: "کیسی باتیں کرتی ہو۔ سرلا! سوسائٹی کا خوف خدا کے خوف سے بھی زیادہ ہے۔ اگر تم نے یہ روش اختیار کی تو میری عزت خاک میں ملا دوگی۔ اور میرا مستقبل سیاہ ہو جائے گا۔ میں سوسائٹی کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤں گا۔ سرلا۔ تم اس وقت غصہ میں ہو مگر جب تمہاری طبیعت ٹھنڈی ہوگی۔ غصہ فرو ہو جائیگا اور تم اس مسئلہ پر غور کروگی تو یقیناً میری یہ خطا معاف کر دوگی۔ ایسی بہت کم عورتیں ہونگی جنھیں اپنی زندگی میں ایسی گتھیاں نہ سلجھانی پڑتی ہوں۔ میں مبالغہ نہیں کرتا ہوں۔ سہاگ میں ایسی باتیں آئے دن ہوا کرتی ہیں۔ مگر پردہ کے اندر میں دوسرے

کا شیدا سہی. کیا تمہیں بھی میری محبت نہیں. اُسی محبت کے صدقے تم ان باتوں کو بھول جاؤ. میں پختہ وعدہ کرتا ہوں کہ اب پھر ایسا موقعہ کبھی نہ آئے گا" یہ کہکر دیرن باہر چلے گئے. اور سرلا وہیں خاموش بیٹھی سوچتی رہی "سوسائٹی کا شیرازہ ایسے کچے دھاگے سے بندھا ہوا ہے"!

غزل

رہی فراق میں بھی شکل روبرو تیری
شبیہ کھینچی تصور نے ہو بہو تیری

معاف رکھ! جو ہیں گلہائے تر سے بیزار مجھے
کہ ان میں رنگ ترا کچھ ہی، کچھ ہی بُو تیری

نسیم صبح کا جھونکا نفس نفس تیرا!
رہے گی سوختہ جانوں کو آرزو تیری

یہ فخر کم نہیں ہم قابلِ خطاب تو ہیں
عزیز اور کے القاب ہیں ہمیں "تو" تیری

دہانِ غنچہ ترے، زبان سوسن سے
چمن چمن میں سنی ہے گفتگو تیری

دل و جگر پھکے جاتے ہیں سوز ہجراں سے
لگن عذاب ہوئی مجھکو شمع رو تیری

کہاں کہاں ترے محروم کو، بقول سرور،
"کشاں کشاں لئے پھرتی ہے جستجو تیری"

گذرے ہوئے ملال فراہم نہ کیجئے
اچھے بھلے مزاج کو برہم نہ کیجئے

پھر کاہشِ ہوس سے تبہ ہوگی زندگی
دشمن پہ رحم کیجئے اب دم نہ کیجئے

الفت کو گر فروغ نہ دیجئے نہ دیجئے
جو رہ گئی ہے اس کو تو اب کم نہ کیجئے

روش میں مجھ پہ عشق کی سب کارنامیاں
اپنے ستم کو لطف سے مدغم نہ کیجئے

مصروف منع گریہ رہے آستین خیر
بسمل کا اس طریق سے ماتم نہ کیجئے

حکیم مارکس آریلیس

مارکس آریلیس ۲۶ر اپریل ۱۲۱ء کو بمقام روما پیدا ہوا۔ اسکا اصلی نام مارکس اینٹونیس ہونا چاہیئے مگر چونکہ اس نے اپنی زندگی کے مختلف حصص میں مختلف نام اختیار کئے ہیں (کیونکہ اس زمانہ میں نام کی تبدیلی بالکل ایک معمولی بات تھی) اس لئے یہ دیکھنا مشکل ہے کہ وہ کس نام سے زیادہ تر مشہور ہے۔ اسکا والد اینیس ویرس جو پریٹر (مجسٹریٹ) کے عہدہ پر ممتاز تھا، رومۃ الکبریٰ کے دوسرے بادشاہ نیوما کی اولاد میں سے تھا۔ اسکی والدہ ڈومیشیا کیلولا بھی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ان دونو کے کیرکٹر بہت اچھے تھے۔ ہمیں اس کے والد کے متعلق بہت کم حالات معلوم ہیں اسلئے کہ آریلیس کی شیرخوارگی ہی میں اسکا انتقال ہوگیا تھا۔ مگر اپنی کتاب "غور و فکر" میں وہ اپنے والد کی بہت تعریف کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ اپنے دادا سے میں نے اخلاقِ حسنہ سیکھے اور یہ بھی سیکھا کہ مزاج پر کس طرح قابو رکھا جا سکتا ہے۔ اپنے والد کی یاد سے میں نے بہادری اور حیا سیکھی اور اپنی والدہ سے خدا ترسی، فیاضی اور سادگی سیکھی۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ تمام بُرے افعال سے کیا بُرے خیالات سے بھی اجتناب کرنا مجھے میری والدہ ہی نے سکھایا تھا۔

ہمارے حکیم کا بچپن اور لڑکپن بادشاہ ہیڈرین کے عہدِ حکومت میں گذرا ہے۔ اس بادشاہ میں اگرچہ چند برائیاں بھی تھیں مگر بہ حیثیت مجموعی وہ دانشمند اور نیک بادشاہوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔

یہ بادشاہ بہت قابل تھا اور اس نے اپنی فراست سے آریلیس میں وہ غیر معمولی اوصاف دیکھ لیے تھے جنہوں نے بعد میں سلطنت میں برکت دی اور عوام کے جذبات کو بہتر بنا دیا۔ یہ بادشاہ لاولد تھا اور اسلئے اس نے کیونینیس کموڈس کو اپنا متبنے بنایا جو اگرچہ بہت کم اوصاف سے متصف تہا مگر اسکی ذاتی خوبصورتی بہت بڑی سفارش ثابت ہوئی۔ جب بادشاہ نے دیکھا کہ میرا آخری وقت قریب آگیا ہے تو اس نے تمام اعیانِ حکومت کو جمع کیا اور ان کے روبرو اپنے متبنے اور جانشین امیریس اینٹونینس کو بھی اس نے اس شرط پر بادشاہ بنانا منظور کیا تھا۔ کہ وہ اپنے بعد مارکس آریلیس کو ہی کو جانشین مقرر کریگا۔ تخت پر بیٹھنے کے وقت اینٹونینس کی عمر ۵۲ برس کی تہی۔

حکیم آریلیس کی تعلیم کا ہمیں اگر کچھ پتہ چلتا ہے تو محض اسکی اپنی تحریروں سے۔ اسکی تعلیم و تربیت اس کے دادا کے یہاں ہوئی جو تین مرتبہ کونسل (ایک معزز عہدہ) رہ چکا تھا۔ وہ اس امر کے متعلق دیوتاؤں کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اسے کسی مدرسے میں نہیں بہیجا گیا ورنہ اخلاقی لحاظ سے اسکی بہی ویسی ہی درگت ہوتی جیسے دیگر طلبا کی ہوئی۔ وہ اپنے دادا کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انھوں نے گھر پر اچھے اُستاد رکھوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے نہایت فراخدلی کے ساتھ تعلیم دی گئی۔ وہ مکہ بازی، اور ارنت اور بھاگنے دوڑنے کا بہت شائق تہا۔ وہ جنگل میں اچھی طرح سے ماہر تہا، اور اسے جنگلی سور کے شکار کا خاص شوق تہا الغرض اسکے تفریحی مشاغل، اسکی اعلیٰ تعلیم، اسکی اخلاقی تربیت اور عزت نے اسکا کیرکٹر بہترین بنا دیا۔ اسکی تعلیم کے تین اوصاف۔

"محنت" "شکر گزاری" اور "نفس کشی" بالخصوص قابل ذکر ہیں کیونکہ وہاں باتوں پر مذہبی حقیقت کے ساتھ زندگی بھر عامل رہا ہے۔

(۱) وہ اپنی کتاب "غور و فکر" میں بار بار وقت کی قیمت کے متعلق ذکر کرتا ہوا اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ کاش مجھے علمی مشاغل کے لئے زیادہ فرصت مل جایا کرے۔ وہ نہایت مستقل مزاجی سے مطالعہ کی ہر صنعت میں محنت کرتا تھا اور اگرچہ اس نے دیدہ و دانستہ فن بلاغت کا مطالعہ نہیں کیا مگر اس نے فلسفہ تعلیم اسلحہ اور رومن لا پر زیادہ محنت صرف کی۔ وہ اپنے اتالیق رسٹیکس کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انہوں نے مجھے غور و فکر کے ساتھ پڑھنے کی عادت ڈالی حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے ایک منٹ کو بھی رائگاں نہیں کھوتا تھا اور اسی وجہ سے اسکی صحت بھی خراب ہو گئی تھی۔

(۲) کتاب "غور و فکر" کے ابتدائی ریمارکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام اُستادوں کا خواہ وہ کیسے ہی معمولی ہوں، نہایت شکر گزار ہے۔ اس نے اپنے ہر استاد سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھا اور اسی وجہ سے وہ فرنٹو، رسٹیکس اور جولیس پروکیولس کو نہایت وقعت کی نظر سے دیکھتا رہا۔ وہ دیاتا ونس کا بھی ان الفاظ میں شکریہ ادا کرتا ہے کہ "انھوں نے اسکے لئے اسکی خواہش کے موافق اتالیق مہیا کر دئے"

وہ اگرچہ اپنے استادوں سے معاشرتی اور ذہنی لحاظ سے بزرگتر تھا مگر اس نے اپنی بلند پوزیشن کے باوجود ان سب سے دوستانہ مراسم رکھے اور مرتے دم تک ان سے عزت اور محبت کا سلوک کرتا رہا۔ اس نے ان کے بجسمے اپنے مکان میں رکھے اور ان کی قبروں پر جاکر

پھولوں کے ہار چڑھایا کرتا تھا۔

(۳) اسکی نفس کشی اور ریاضت اسکی محنت اور شکر گزاری سے زیادہ مشہور ہے۔ اس شخص کو اگرچہ ہر قسم کے عیش و آرام کے سامان مہیا تھے مگر اس نے تن پروری کو ہمیشہ تنفر کی نظر سے دیکھا۔ اسکی یہ مثال ان نوجوانوں کے لیئے قابل تقلید ہے جو سیکنڈ کلاس گاڑیوں میں سفر کرنا اپنے لئے موجب فخر خیال کرتے ہیں جو انتہائی فیشن کے دلدادہ ہونے کے علاوہ برفوں اور شربتوں پر اسقدر روپیہ برباد کر دیتے ہیں جو ایک غریب شخص کے لئے سال بھر تک کافی ہوسکتا ہے۔ یقیناً وہ اس زندگی کو پڑھکر یہ معلوم کرینگے کہ اس شریف رومن کی نفس کشی ہماری تن پروری سے نہایت ارفع و اعلےٰ ہے۔ وہ ابتدا ہی سے محنت کی زندگی بسر کرنے کا عادی تھا اور اسے ہر قسم کے سامانِ مسرت سے نفرت تھی۔ وہ جو کچھ کرتا تھا اپنے ہاتھوں سے کرتا تھا۔ گیارھویں سال کے سن میں اسکی ملاقات حکیم ڈائگنٹس سے ہوئی جس نے سب سے اول اسے اسٹوئک فلسفہ سے آشنا کرایا۔ بارھویں سال کی عمر میں اس نے فرقہ اسٹوئک کا لباس اختیار کرلیا۔ اس فلسفہ نے اسے سکھایا کہ "لکڑی کے فرش پر سونا بہتر ہے" کہا جاتا ہے کہ وہ لکڑی کے فرش پر کسی جانور کی کھال اس لیئے بچھایا کرتا تھا کہ اسکی ماں نے بہ منت اسے بچھانے کے لیئے درخواست کی تھی وہ وہ کسی تخت پر یا زمین کے فرش پر سونا زیادہ بہتر خیال کرتا تھا۔ لیکن وہ یہ کام کبھی نمود اور تمنائے تحسین کے بغیر کیا کرتا تھا۔ اسکے دوست اسے ہمیشہ بشاش پاتے تھے اور اسکی سکوت آمیز طرزِ عمل میں ایک خاص وقار اور تفکر معلوم ہوتا تھا۔ بدمزاجی یا افسردگی اسمیں نام کو نہیں تھی۔

مارکس آریلیس کے سرپرستوں نے اسکے لیئے زمانے کے ممتاز ادبی اُستادوں کو جمع کر دیا تھا۔ یونان یا اٹلی کے کسی شاہزادے کے لئے تعلیم و تربیت کا اتنا اہتمام نہیں کیا تھا جتنا اسکے لیئے کیا گیا تھا، اور ساتھ ہی واقعہ بھی یہ ہے کہ آجتک کسی اُستاد کو ایسا شکر گزار، منکسر المزاج اور بے لوث شاگرد بھی میسّر نہیں ہُوا۔ کواڈی کی جنگ کے دوران میں اس نے ایک کتاب لکھی جسمیں اس نے اپنے تمام اوستادوں کا شکریہ ادا کیا۔ یہ کتاب بھی کتاب "غور و فکر" کا ایک جزو بن گئی ہے اگرچہ اسکی ساری عمر طرح طرح کے مصائب و واقعات سے لبریز ہے، لیکن اس نے ہمیشہ ان سے علیحدگی کی اور ان بڑی بڑی صفات پر غور کرتا رہا جو اسکے مشاہدے میں آتی ہیں اور ساتھ ہی وہ ان تمام اسباق پر بھی غور کرتا رہتا تھا جو اسکے نزدیک اس کے اوستادوں کی تعلیم سے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

اپنے ایک نگران سے اس نے محنت کرنے اور مغلظات سننے سے احتراز کرنے کا سبق سیکھا۔ ڈائگنی ٹس سے اس نے اوہام باطلہ سے نفرت رکھنے اور نفس کشی کرنے کا سبق حاصل کیا۔ اپولونیس سے سیکھا استقلال اور برداشتِ مصائب کرنا چاہیئے اور بغیر کسی ظاہری نمود کے متانت اختیار کرنی چاہیئے۔ اسی حکیم نے اسے یہ سبق دیا تھا کہ ہر شخص سے نرمی نیازی اور حلم سے پیش آنا چاہیئے۔ سیکسٹس نے اسے یہ سکھایا کہ ہر وقت طبیعت کو نیکی کرنے پر مائل رکھنا چاہیئے اور ساتھ ہی یہ یقین کرنا چاہیئے کہ میرے دوست مجھ سے محبت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ میکسی مس سے اس نے یہ سیکھا کہ طبیعت میں بھاری بھرکم پن اور وقار اور شیرینی پیدا کرنی چاہیئے اور جو کچھ کام سامنے رکھا جائے اسے بغیر

کسی شکایت کے کرنا چاہیئے۔ اسکندر سے اس نے یہ سیکھا کہ نہ تو اثنائے گفتگو میں کسی سے یہ کہا جائے اور نہ چٹھی میں کسی شخص کو یہ لکھا جائے کہ مجھے فرصت نہیں ہے، اور نہ ہمیشہ یہ کہکر چھوٹے کاموں کو بغیر کئے چھوڑ دینا چاہیئے کہ مجھے ضروری کام ہو گئے تھے۔"

ان استادوں کے علاوہ اش کس نے بھی اسے سیدھی سادی عبارت لکھنے اور ہر قسم کی نمود سے بچنے کی ہدایت کی تھی۔ اینٹونی نس جس نے مارکس اریلیس کو متبنّٰی بنا رکھا تھا اور جو آریلیس کے نزدیک باحیا، وفادار، اور مستقل مزاج بادشاہ کی زندہ مثال تھی۔ ہمیشہ ہمارے ہیرو کے پیش نظر رہتا تھا۔ یہ وہ بادشاہ تھا جسے خوشامد سے نفرت تھی اور جو تصنع کو حقارت کی نظر سے دیکھتا، جو دانشمند اشخاص کی عزت کرتا اور سخن اشخاص کو مراتب عطا کرتا تھا اور جو سلطنت کے کاروبار میں نہایت مشغول رہتا تھا۔ مارکس آریلیس کسی دوسرے مقام پر بھی تعریف کرتا ہوا لکھتا ہے کہ نداترسی، پاکیزگی حلاوت سخن، استقلال، سادگی، صبر کی صفات اسمیں پائی جاتی ہیں۔ ان الفاظ کے لکھنے کے بعد وہ کہتا ہے کہ " تو اِن تمام باتوں کا تتبع کرتا کہ تیرا ضمیر مرتے وقت ایسا ہی پاکیزہ ہو جائے جیسا کہ اسکا تھا۔"

اپنے استادوں اور آبیقوں کی شکر گزاری کرنے کے بعد وہ دیوتاؤں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انہی کی رہنمائی سے میں نے فلسفہ کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا تھا اور انہی کا فضل تھا کہ میں گناہ سے اجتناب کرتا رہا۔ ایک اور جگہ وہ لکھتا ہے کہ "میں اس لئے بھی دیوتاؤں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی عنایت و فضل سے مجھ پر ایسی حالات طاری نہیں ہوئیں جن کے باعث مجھے آزمایش میں پڑنا پڑتا۔ مزید برآں میں

ایک ایسے بادشاہ اور والد کے ماتحت تھا جنہوں نے میرے دل سے تمام غرور و تکبر نکال دیا اور مجھے یہ سکھایا کہ محل میں محافظ سپاہیوں، کشیدہ کپڑوں، مجسموں اور اس قسم کی دیگر نمائشوں کے بغیر زندگی بسر کرنی ممکن ہے۔ نیز یہ کہ اگرچہ میری والدہ کا نوجوانی میں انتقال ہوگیا تھا۔ مگر اس نے اپنے آخری برس میرے ساتھ بسر کئے۔ یہ کہ بچپن میں میرے لئے بہت سے لائق اُستاد مہیا کیے گئے۔ اور ان امور کے لیئے دیوتاؤں اور قسمت کی امداد کی ضرورت ہے۔"

اس شہنشاہ اور حکیم کی کتاب "غور و فکر"، اس قابل ہے کہ اس زمانے کے لوگ اسے گہری توجہ سے پڑھیں حقیقت میں جس نفس کشی کا اظہار اس میں کیا گیا ہے، وہ ہمارے روزافزوں سامانِ آسائش و آرایش کے لئے ایک زبردست تازیانہ کا کام دے سکتی ہے۔ ساتھ ہی اس میں حسن توکل برضائے خداوندی کا ذکر ہے، وہ ہماری مسلسل بے چینی اور بے اطمینانی کے لئے ایک زبردست دھمکی ہے۔ علاوہ ازیں کتاب میں جو بلند پروازیاں دکھائی گئی ہیں وہ موجودہ زندگی کے مراسم کی لاانتہا بیہودگیوں کو شرم دلانے کے لئے کافی ہیں۔

سنہ ۱۳۸ء میں ہیڈرین کے انتقال کے بعد اینٹونینس پائس تخت پر بیٹھا اور متوفی شہنشاہ کی وصیت کے مطابق مارکس آریلیس اور لیوسیس کموڈس کو متبنیٰ بنا لیا۔ مارکس کی منگنی ۱۵ برس کی عمر میں کموڈس کی ہمشیرہ سے قرار پاگئی تھی، لیکن جدید شہنشاہ نے اس قرارداد کو فسخ کردیا۔ اور اس کے بجائے اپنی بیٹی فاسٹینا سے منگنی ٹھیرادی مگر شادی سات سال بعد

اینٹونینس کا عہد حکومت ان عمدہ زمانوں میں سے ہے جن کی کوئی تاریخ نہیں۔ اس زمانے میں ہر جگہ تقریباً امن ہی رہا۔ ٹیکس کم کردے گئے، لوگوں کی مصائب ہلکی کی گئیں، محکمہ جاسوس کم کیا گیا۔ ضبطیاں بہت کم عمل میں آئیں اور قتل و سازش کے واقعات بہت کم رونما ہوئے۔ ساری رعایا اپنے بادشاہ سے محبت کرتی تھی اور شہنشاہ کا بھی صرف یہ مقصد تھا کہ لوگوں کے آرام و آسایش کا خیال رکھے۔ اس نے یہ سیکھ لیا تھا کہ "جو چیز شہد کی مکھی کے لئے سود مند ہے وہی مکھیوں کے چھتہ کے لئے ہی مفید ہے"۔ اس نے جمہوریت کے طریقہ سے حکومت کی تھی۔ اسے لڑائی سے اصلی نفرت تھی اور یہی وجہ ہے کہ اسنے "امپریٹر" کے فوجی لقب کو اپنے لئے استعمال کرنا پسند نہیں کیا۔

ایسے دانشمند اور قابل تعریف بادشاہ کے ساتھ مارکس آریلیس نے ۲۳ سال کا زمانہ بسر کیا۔ ان دونوں کے تعلقات اسقدر قریب تھے اور ان کی محبت اسقدر زیادہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو باپ اور بیٹا سمجھتے تھے اور اس طول و طویل زمانہ میں آریلیس دو مرتبہ سے زیادہ اینٹونینس کے مکان سے باہر نہیں سویا۔ ان دونوں میں کسی قسم کا باہمی رشک و حسد نہ تھا، بلکہ برخلاف اسکے وہ ایک دوسرے کے مشیر تھے۔ شہنشاہ نے اپنے جانشین کو "سیزر" کا لقب عطا کیا تھا اور اسے ہر قسم کے اعزاز عطا کئے تھے۔ دیگر امرا کو ایسے تعلقات دیکھکر جلن پیدا ہوئی اور انھوں نے اس باہمی اعتماد کو زائل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ اینٹونینس نے آریلیس کی والدہ کو دیکھا کہ دیوتا "اپالو" کے مجسمہ کے روبرو نہایت تضرع اور عاجزی کے ساتھ

دعا مانگ رہی ہے۔ ویلیریس آمیوس نے شہنشاہ کی توجہ اس طرف مبذول کی اور کہا کہ "آپ کیا خیال کرتے ہیں کہ یہ اسقدر عاجزی کے ساتھ کیا دعا مانگ رہی ہے۔ یہ کہہ رہی ہے کہ خدا کرے کہ شہنشاہ مرجائے اور میرا بیٹا اسکی بجائے تخت نشین ہوجائے" یہ بات بظاہر معمولی سی دکھائی دیتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر اس شہنشاہ کی بجائے کوئی اور معمولی ظرف کا بادشاہ ہوتا تو وہ یقیناً مارکس آریلیس کی طرف سے بدظن اور متنفر ہوجاتا۔ مگر اینٹونینس نے اس بات کو نفرت آمیز خاموشی کے ساتھ سنکر ٹال دیا۔

یہ بادشاہ اکثر روما ہی میں رہتا اور ہیڈرڈ کی طرح اسے جہان گشت بننے کا شوق نہ تھا۔ اسے عمارتوں سے بھی زیادہ کچھ دلچسپی نہ تھی، اور نہ اسے اپنی خوراک و پوشش کا کچھ خیال تھا وہ عزلت نشین تھا اور اسکی ساری زندگی راہب درویش کی سی بسر ہوئی، مگر اس نے راہبوں کی طرح کبھی اپنے جسم کو ناجایز تکلیف نہیں دی۔

سنہ ۱۶۱ء میں جبکہ بادشاہ کی عمر ۷۵ سال کی تھی اور مارکس آریلیس کی عمر صرف ۴۰ سال کی تھی، بادشاہ بمقام لوریم بخار میں مبتلا ہوگیا اور اس نے یہ محسوس کرکے کہ اب آخری وقت آپہنچا ہے، تمام امرائے سلطنت کو بلایا اور ان کے سامنے باضابطہ طور پر مارکس آریلیس کو اپنا جانشین قرار دیا۔ اس نے سب لوگوں کو تسلی و تشفی کرنے کی تلقین کی اور مارکس کے کمرہ میں قسمت کا طلائی مجسمہ بھجوا دیا۔ یہ طلائی مجسمہ ہمیشہ شہنشاہوں کے پرائیویٹ کمروں میں رکھا رہتا تھا اور اسے خوشحالی کی نیک فال سمجھا جاتا تھا۔

جدید شہنشاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس نے

اپنے برادر مجازی (جسے انٹونینس نے مارکس کے بعد اپنے متبنی بنایا تھا) لوسیلس ویرس کو تمام ملکی اعزازات سے مشرف کیا اور ساتھ ہی "سیزر" اور "آگسٹس" کے معزز لقب عطا کئے۔ مارکس نے اسے فوج کا کمانڈر انچیف بھی بنا دیا تھا اور تمام سول معاملات کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھی۔ مگر یہ شخص اپنے عہدۂ جلیلہ کا اہل ثابت نہیں ہوا۔

ملکہ فاسٹینا سے مارکس کے یہاں بہت اولاد ہوئی عہدِ حکومت کے اول سال میں دو لڑکے ایک ساتھ پیدا ہوئے جن میں فقط ایک شہنشاہ کموڈس (۱۸۰ء سے ۱۹۲ء تک) زندہ رہا جس کی عیاشانہ اور جابرانہ زندگی نے سب رعایا کے دلوں میں نفرت پیدا کر دی تھی۔ دو بچوں کا ایک ساتھ پیدا ہونا رومیوں میں ایک فال بد سمجھا جاتا تھا اور اس لڑکے کے پیدا ہوتے ہی با امن سلطنت پر مصائب کا طوفان اُمنڈ پڑا۔ سب سے پیشتر دریائے ٹائبر کی طغیانی روما کے ایک حصہ کو برباد کرنے کے علاوہ ہزارہا مویشیوں کو بہا لے گئی۔ فصلیں تباہ ہو گئیں اور ان تمام باتوں کا نتیجہ خوفناک قحط کی صورت میں نکلا۔ اس عہدِ حکومت میں بہت سے زلزلے آئے، بہت سے شہر جل کر خاکستر ہو گئے اور طرح طرح کی خوفناک ... پھیلیں۔ بادشاہ نے ان تمام قدرتی مصائب کو ہلکا کرنے کی اپنے ... بھر کوشش کی، مگر اس اثنا میں لڑائیوں کے خوف اور لڑائیوں کی افواہوں نے ملک کی رہی سہی حالت کو اور بھی زیادہ نقصان پہنچایا۔ بادشاہ والوجیس نے شام کے صوبہ کو جو رومیوں کے ماتحت تھا، تباہ و برباد کر دیا۔ کیٹی کی اقوام جرمنی پر ٹڈیوں کی طرح چھا گئیں اور وہاں جا کر انھوں نے آگ اور تلوار کے ذریعہ غارتگری شروع کر دی۔

انگلستان سے ہی بغاوت اور شور وشغب کی خبریں آنے لگیں۔ الغرض مارکس آرلیس کے عہد میں شروع سے آخر تک ہی جھگڑے ہوتے رہے۔

چونکہ بادشاہ دالوجیسس کا حملہ ان سب سے زیادہ بڑا تھا، اس لئے اس کے مقابلہ کے لئے ویرس کے ماتحت فوج روانہ کی گئی۔ اس معرکہ میں جنرل ایویڈیس کیسیس کی اعلیٰ قابلیت کی بدولت سلطنت کی عزت برباد ہونے سے بچ گئی۔ یہ دونو جنرل اس لڑائی کے فتح کرنے کے بعد اس تزک و احتشام کے ساتھ شہر میں داخل ہوگئے جو اس زمانہ میں فاتحوں کے لئے روا رکھی جاتی تھی۔ مگر رومی فوج واپسی پر اپنے ساتھ وبا لیتی آئی۔ چنانچہ ویرس بمقام ایکوئیل اسی وبا کے نذر ہوگیا۔

بادشاہ نے کمانڈر ویرس کی لاش کو بادشاہ ہیڈرڈ کی قبر کے برابر نہایت اعزاز کے ساتھ دفن کیا۔ لوگوں نے اس نیک دل بادشاہ پر ویرس کے قتل کا الزام عائد کیا مگر یہ سراسر حقیقت کے خلاف ہے اسی لئے کہ بادشاہ نے ہمیشہ اس کے قصوروں کی عیب پوشی کی اور باوجود اسکی نااہلیت کے اسکو ہر قسم کی عزت سے مشرف کیا۔

مارکس باوجود اس امر کے کہ شہنشاہ تھا، مگر اسمیں کسی قسم کا غرور و تکبر پیدا نہیں ہوا وہ ہمیشہ حلیم الطبع رہا۔ وہ درحقیقت اپنے آپ کو تمام بندگان خدا کا خادم تصور کرتا تھا۔ حفاظت نابالغان، سڑکوں کی درستی، درستی اخلاق، تقرر مجسٹریٹ وغیرہ کے مسائل ہمیشہ اسکے پیش نظر رہتے تھے۔ اسنے مقدمہ بازی کو کم کیا، گلیڈی ایٹرز کے خون آلود کھیلوں کو محدود کر دیا اور اسکے علاوہ بہت سے رفاہ عام کے کام کیے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے اسکی صحت خراب ہوگئی۔ بڑے بڑے تماشاؤں اور کھیلوں میں اگرچہ اسکی موجودگی ضروری تھی مگر یہاں بھی وہ پڑھتے یا نوٹ لکھتے

اقبال

تقریباً آٹھ برس ہوئے کہ اقبال نے یہ نظم یورپ کی مادہ پرستی کے خراب اثرات کو دیکھکر یورپ کے قیام ہی میں لکھی تھی کہ پہلے ہی کہ حقیقی شاعر تلمیذ الرحمن ہوتا ہے۔ جو کچھ آٹھ برس پیشتر شاعر کے دماغ میں تھا وہ آج ہو بہو پیش آرہا ہے ہمارا ایمان ہے کہ روحانیت کو مادیت پر فتح ہوگی

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز پھر آشکار ہوگا

گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپکے پیتے تھے پینے والے
بنیگا سارا جہان میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آ بسینگے
برہنہ پائی وہی رہیگی مگر نیا خار زار ہوگا

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیر میخانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے خوار ہوگا

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنیگا وہ ناپائدار ہوگا

سفینۂ برگ گل بنا لیگا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

جنھوں نے میری زبان گویا کو محشرستان صدا لکھا تھا
مرا وہ دل چیر کر جو دیکھیں تو واں سکوت مزار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

جو ایک تھا اے نگاہ تو نے ہزار کرکے دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا

کہا جو قمری سے میں نے اکدن یہاں کے آزاد پا بگل ہیں
تو غنچے کہنے لگے ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنونگا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

یہ رسم بزم فنا ہے اے دل گناہ ہے جنبش نظر بھی
رہیگی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بیقرار ہوگا

میں ظلمت شب میں لیکے نکلونگا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثال شرار ہوگا

نہ پوچھو اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اسکی
کہیں سر رہگذار بیٹھا ستمکش انتظار ہوگا

شب ماہ

مبارک کا مہینہ قریب اختتام کے پہونچ گیا ہے گرمی اب غیر معمولی ترقی پر ہے باد سموم کے تند اور سخت جھونکے اس شدت کے ساتھ چلتے ہیں کہ راستہ چلنے والے اگر دو قدم آگے بڑھتے ہیں تو ایکقدم پیچھے کو ہی ضرور ہٹ جاتے ہیں اگر کوئی گل اندام نازک گلفام کسی اشد ضرورت کی وجہ سے باہر نکلتا ہے تو ظالم لو اوسکے گورے گورے نازک رخسار و نپر تپانچے مار مار کر آگ بھبوکا بنا دیتی ہے۔ کپڑوں کی حالت تو قابل بیان نہیں۔ ٹوپی سر پر رکھنا محال ہو گئی ہے رومال کہ کندھے پر ٹھہرتا ہی نہیں۔ اچکن کے دامن مور چھلے کی طرح ہوائیں فر فر کرتے چلے جاتے ہیں۔ درختوں کا زمردی لباس لو کی شدت سے جل بھن کر خاکستر ہو چکا ہے۔ مگر قدرت کی نیرنگیاں دیکھیے کہ ادھر پیڑ پوری طرح پت جھڑ ہونے نہیں پاتے ادھر نئی نئی کونپلیں نکلنا شروع ہو گئیں اہاہا پلکھن کے درخت کو تو دیکھیے کہ کیا ہی خوشنما نئی نئی پتیاں سرخ و سبز نمودار ہوئی ہیں مگر ابھی تک لو کی تیزی کم نہیں ہوئی۔ اف ہوا کے سناٹے کے ساتھ ہی ساتھ وحشت بھی کچھ اسطرح سن سنا رہی ہے کہ ہر فرد بشر کے دل شگفتہ کے کنول کو پژمردہ کئے دیتی ہے۔ بیچارے غریب اور مزدور پیشہ آدمی اپنی اپنی مزدوریوں پر لگے ہوئے ہیں معمار بلند اونچی اونچی پاڑوں پر بیٹھے ہوئے بسولیاں بجا رہے ہیں مزدور اینٹیں اور ٹوکریوں میں بھر بھر کر سر پر رکھے ہوئے ایک ہاتھ سے لمبی اور پتلی بلیوں کے ڈنڈے پکڑے ہوئے اور دوسرا ہاتھ سے

نوکری تھامے ہوئے برابر پہنچا رہے ہیں۔ گرمی کی شدت سے پسینہ ٹپکتا جاتا ہے مگر وہ برابر اپنے کام کو انجام دے رہے ہیں۔

ان کی محنت سے بےخبر آرام و راحت کی زندگی بسر کرنیوالے امراد رؤسا اگرچہ اس تکلیف میں نہیں ہیں اور بہ نسبت ان غرباء کے نہایت عیش و آرام کے ساتھ ٹھنڈے کمروں میں لیٹے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف سے روشندان اور کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں جن میں خس کی ٹٹیاں لگائی گئی ہیں جن کی وجہ سے یہی باد سموم اونکے لئے نسیم سحری کی تاثیر پیدا کر رہی ہے فرشی پنکھا برابر اپنی رفتار کے ساتھ چوں چوں چوں چوں کی صدائیں لگاتا ہوا چل رہا ہے مگر پھر بھی شدت گرمی سے اکثر بیتاب ہو ہو کر "اُف گرمی اُف" پکار اوٹھتے ہیں۔ آفتاب عین مقیاس پر پہنچگیا ہے ٹھیک نصف النہار کا وقت ہے بازاروں کا ہنگامہ اور چہل پہل بالکل موقوف ہے کوئی اکا دُکا آدمی بڑی ضرورت کا مارا بیچارا ادھر اُدھر لگا تا پھرتا ہے۔ یا برف اور سوڈے والا اپنا ٹھیلا لئے ہوئے گلی کوچہ میں "سوڈا واٹر۔ سوڈا لیمونیڈ۔ یہ ٹھنڈا میٹھا برف۔ یہہ ملائی کا برف۔ یہہ ربڑی کا پچھے دار برف" کی صدائیں لگاتا پھرتا ہے۔ موسم بہار نے باغوں میں اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا ہے مگر دھوپ کی تپش سے سب بیل بوٹے پھول پھلواریاں کسی عاشق مہجور کے افسردہ دل کی طرح کمہلا گئے۔ خدا خدا کر کے دن ڈھلنا شروع ہوا۔ امراو رؤسا نازنیناں اپنے خواب ناز سے بیدار ہو گئے ہیں یہ اور بستر استراحت سے اوٹھ اوٹھ کر چلمنیں الٹ اولٹ کر صحن مکان میں دھوپ کو دیکھ رہے ہیں اسوقت دھوپ دیواروں پر چڑھ گئی ہے کسی نے تو صرف منہ ہاتھ دھو کر کپڑے پہن لئے اور اکثر صفائی پسند اور نفیس طبیعتوں نے

واسے غسل کر کے لباس بدلنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اب پانچ بج چکے ہیں بازاروں میں پھر وہی صبح کی طرح حسب معمول چہل پہل ہونے لگی مگر اسوقت کچھ عجیب لطف ہے۔ سڑکوں پر چھڑکاؤ ہو چکا ہے گرد وغبار کا نام نہیں اگرچہ لکھنؤ کے سارے ہی بازاروں میں خوب رونق ہے لیکن جو دلچسپی اور تفریح کے اسباب سبزی منڈی میں مجتمع ہیں وہ اسوقت کچھ عجیب لطف پیدا کر رہے ہیں۔ سبزی فروش اپنی دوکانوں پر قسم قسم کے میوہ جات اور ترکاریاں چُن چُن کر لگا رہے ہیں ایک طرف سیب رکھے ہوئے کیسی سیب زنخداں اور گلابی گلابی رخساروں کی یاد دلا رہے ہیں ہری ہری پتلی پتلی ککڑیاں کیا ہی نازک ہیں جنکو دیکھکر کسی کی نازک کلائیوں کی تصویر پیش نظر آجاتی ہے۔ ہر قسم کی ترکاریاں پھل پھلار رنگا رنگ کے میوے کچھ عجب بہار دکھلا رہے ہیں۔ ایک مقام پر مالی اور مالنیں گلاب کے پھول رابیل چنبیلی کے ہار چنپا موتیا جوہی کے پھول گجرے مولسری کے ہار لئے بیٹھے ہیں آؤ چلیں ذرا قیصر باغ کی بھی سیر دیکھ آئیں۔ اہاہا وہ کمہلائے ہوئے درخت پھلواریاں سب سرسبز اور تروتازہ ہو گئے ہیں چاروں طرف سے کیا ہی بھینی بھینی خوشبو آرہی ہے۔ آنکھوں میں کھپ جانے والا سبزہ کس شان سے اپنا فرش بچھا رہا ہے کہ دیکھکر آنکھوں میں ٹھنڈک اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے بلبلیں چہچہا رہی ہیں قمریاں سرو پر بیٹھی ہوئی آزادی کے گیت گا رہی ہیں کوئل کی آواز دلکو بیقرار کیئے دیتی ہے۔ آہ یہ سین دیکھکر ہم سے بھی خاموش نہ رہا گیا اور بے اختیار دلِ بیقرار سے یہ اشعار نکلے اور زبانی گراموفوں میں آکر گونجنے لگے۔

غزل

ہمیں تو چین سے گذرا نہ اک لحظہ بھی بچپن میں
ہوا کمبخت یہ عشق بتاں پیدا لڑکپن میں

پھرا کرتے ہیں ہم چنتے ہوئے تنکے اسی دھن میں
ترا سودا لئے پھرتا ہے ہمکو جنگل و بن میں

سدا آتا ہی خوش بزم حسینان جہاں ہمکو
بہلتا ہی دل مضطر ہمیشہ سیر گلشن میں

حسینانِ جہاں غمزے کنا ہم سے کرتے ہوں
نظارے لٹ رہے ہوں بیٹھے بیٹھے خود در بن میں

کوئی نازک بدن گلرو مرے پہلو میں بیٹھا ہو
گلے میں ہار پہنے ہو پڑے ہوں پھول دامن میں

مہکتے ہوں ادھر تو گل چہکتے ہوں ادھر بلبل
ٹہلتے ہوں لیا ہاتھ ڈالے اونکی گردن میں

پھر اک جلسہ ہو جسمیں ہر طرح کی ہوں بہم اشیا
کہ گلدستے رکھے ہر سو بچھا ہو فرش آنگن میں

سر بزم پری پیکر وہ پری سج بن کے آ بیٹھے
عجب انداز کا جادو بھرا ہو اونکی چتون میں

گھٹائیں چھا رہی ہوں ننھی ننھی پڑ رہی ہوں بوندیاں
پڑے جھولوں میں گاتے ہوں بہاریں یار وہ دن میں

اگر اک دم کو ہو پنہاں مری آنکھوں سے وہ جانا
کھلے دروازہ آنکھیں لگ رہی ہوں شوق دیدن میں

دلِ مضطر کی بیتابی مٹا دے جلد وہ آ کر
مسیحائی بھری ہو کوٹ کر اوس چشم پر فن میں

شراب وصل سے بیخود بنا دے ساقی گلرو
مزہ آئے وہ جس سے محو ہوں میں اوسکے جوبن میں

آفق دل کی تمنائیں جو نکلیں بھی تو کیا حاصل
نہ چھوڑیگا تجھے پیکِ اجل گلشن میں اور بن میں

دن ختم ہو چکا آفتاب کو غروب ہوئے کامل ایک گھنٹہ گذر چکا ستارے چمکنے لگے اور چاند کی آمد کی خوشخبری سنانے لگے اب چاندنی رات اپنی رونق دکھلا رہی ہے چندا شاہ اپنی معمولی آن بان شوکت و شان کے ساتھ جانب مشرق سے بر آمد ہوئے آج چاند کی چودھویں ہے چاند اپنے پورے چہرے مہرے کے ساتھ نکلتا ہوا ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا کوئی نازنین مہ جبین اپنے رخ تاباں سے برقع اٹھائے ہوئے کسی عاشق منتظر

دیدار کی طرف دوڑی چلی آتی ہے اور واقعی عشاق جو اسوقت خوش ہوتے ہیں اوسکی یہی وجہ ہے کہ چاند میں چونکہ انسانی مشکل دکھائی دیتی ہے بس وہ دیدار یار کا تصور باندھکر محو نظارہ مہتاب ہو جاتے ہیں۔ آہا ہا تمام روئے زمین پر چاندنی کا فرش بچھا ہوا ہے شجر جو دیوار در چاندنی کا لباس پہنے ہوئے چاندی کی طرح چمک رہے ہیں۔ دنکی گرمی کی ستائی ہوئی تکلیف اُٹھائی ہوئی مخلوق آرام سے پیر پھیلائے ہوئے ٹھنڈی چاندنی اور تاروں کی چھاؤں میں سو رہی ہے۔ واقعی اے چاندنی اللہ پاک نے تجھے ایک بڑی نعمت عظمیٰ بنایا ہے سبحان اللہ کیا نور ہے ہر شخص کا دل مسرور ہے اللہ کے نیک بندے مسجدوں کے صحن میں خشوع خضوع سے نمازیں پڑھ رہے ہیں کہیں خوش الحان قاری مصری عربی لہجوں میں قرآن پاک ایسے مؤثر اور دلکش آواز سے تلاوت کر رہے ہیں کہ سننے والوں کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل بیتاب ہوا جاتا ہے ایک طرف خدائے پاک کے دنیادار شوقین مزاج بندے باغوں کوٹھیوں مکانوں کے صحنوں میں بیٹھے ہیں کرسیوں پر دوست احباب کا مجمع ہے اور اس وقت کی دلچسپیوں کا لطف اُٹھا رہے ہیں بیچ میں ایک تخت پر گھڑے اور نازک صراحیاں برف کے پانی اور شربت سے بھرے ہوئے رکھے ہیں صراحیوں کی گردنوں میں ہار پڑے ہوئے ہیں چاروں طرف گلدستے رکھے ہوئے ہیں ایکطرف میز پر ہارمونیم رکھے ہوئے کوئی خوش گلو اپنی سریلی آواز اور سکے مست کر دینے والی دلکش آواز کو ملا ملا کر ایسے دلآویز لہجہ میں گا رہا ہے کہ سامعین کے دلپر ایک بیخودی کا عالم طاری ہے۔

چندا شاہ اُسی شان و شوکت کے ساتھ دربار کر رہے ہیں ستاروں کی

تمام فوج حاضر ہے مگر اپنے بادشاہ کے دبدبہ رعب کی وجہ سے ایسے غایب ہیں گویا سب غایب ہیں۔ مگر نہیں برابر آہستہ آہستہ رعب استقلال سے ساتھ ملک مغرب کے فتح کرنے کو برابر بڑہی چلی جا رہی ہے۔

تقدیر کے یاور، اور خوش نصیب عشاق اپنے اپنے معشوقان نازنین سے ہم آغوش ہیں، اور عیش وصل میں مدہوش ہیں۔ ایکطرف بیچارے محرومانِ وصال پڑے ہوئے کبھی آہ کرتے ہیں کبھی بالکل خاموش ہیں کوئی حسرت بھری آواز میں اس غزل کو پڑھ رہا ہے اور خیال یار سے باتیں کر رہا ہے۔

غزل

لطف جب آئے کہ اے دوست تو ہو چاندنی رات
محفل اگ ہو سینوشی ہو اور چاندنی رات

باغ میں لالہ و گل مہک سے رہوں ہر سو
بھینی خوشبو بہی وہاں آتی ہو اور چاندنی رات

ساقی سیم تن اک جام پلادے ہمکو
ماہرو سامنے اک گاتی ہو اور چاندنی رات

ہو رقیبوں کا نہ کہٹکا نہ کسی شے کا غم
نازنیں پہلو میں اک سوتی ہو اور چاندنی رات

عیش ہو وصل ہو آرام ہو راحت ہو افق
دلکی حسرت مری بر آتی ہو اور چاندنی رات

آہ ایک دن وہ تہا کہ چاند رات کو چاند نہایت باریک کسی کے ہلال ابرو کی یاد دلاتا ہوا نکلا بڑہتے بڑہتے چودہویں رات تک بڑہا اور کسی کے روح تاباں کا تمام رات جلوہ دکہایا۔ پندرہویں سے گہٹنے لگا اور گہٹتے گہٹتے وہی ہلال رہگیا۔ اور کوئی ارمان بہی اول حسرت کے ساتہہ۔ دو چار دن کی چاندنی اور پہر اندھیری رات ااکہکر افسردہ ہوگیا۔ آہ اللہ بس باقی ہوس۔ فقط

سید حبیب احمد افق امروہوی

عرفجہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

عرفجہ نے اِس شاطرانہ کامیابی اور مساعدت احوال کی اطلاع اپنے ایک ایسے معزز و موقر رازدار (عمرو ابن طارق امیر (صوبہ دار) مدینہ کو کی۔ جسکے وعدے اوسکی طمع دُنیا و حرص جاہ کی کفالت سے ضامن ہورہے تھے۔

عمرو ابن طارق کا نام چونکہ ناظرین کے لئے بالکل نیا نام ہے۔ پس واقفیت کے لحاظ سے نامناسب نہوگا اگر ہم اِس موقعہ پر عمرو ابن طارق اور عرفجہ کے تعلقات اور اونکے موجبات پر روشنی ڈالکر قصہ کی طرف رجوع کریں۔

اصل میں ہمارے قصہ کی جان نازک ندامسیہ پر جو جبر و سختی اور جس قسم کا سلوک ناروا ہورہا ہے۔ وہ اِسی عمرو ابن طارق کے حُب دولت وجاہ سے مغلوب۔ کیا آفرین طبیعت کی اختراع خاص ہے۔ اوسے مال ومتاع اور دُنیاوی عزت و اقتدار کی چاہ تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اوسکا دُرِ مقصود جہاں سے حاصل ہوسکتا ہے وہ حجاج ابن یوسف کی سرکار عظمت مدار ہے جس کی شاہد پرست و بادہ گسار طبعِ رنگین پر فتح حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہے تو یہی کہ کسی معشوقہ شیریں اَدا سے اوسکا کاشانۂ شوق منور و معمور کرایا جائے۔ اسی بُنیاد پر اوس نے کنایۃً عرفجہ کا استمزاج کیا کہ سمیہ کے لئے اگر کسی بڑی جگہ کی نسبت کا پیغام اوسکے سامنے پیش کیا جائے تو اوسکے

شرائط کچھ اہم تو نہوں گے۔ اور دو ہی فقروں میں اوس نے اندازہ کرلیا کہ طمع زر کے سوا اوسکے مخاطب میں کسی قسم کا حوصلہ نہیں۔ اِس کے بعد صاف الفاظ میں اوس نے ظاہر کیا کہ اگر وہ خواہش رکھتا ہے تو حجاج ابن یوسف کے مخدرات عالیہ میں داخل ہونے کی عزت دسمیہ کو دلا سکتا ہے۔

عرفجہ اِس منتہائے عروج پر پہونچانے والی مگر اپنے حاشیۂ خیال میں بہی نہ آنے والی تدبیر کو سنکر ششدر و حیران رہ گیا۔ اور مسرت خیز استعجاب کا اظہار کیا۔ جسکی اِس تنگی ظرف اور پستی حوصلہ کو دیکھکر عمرو ابن طارق اپنی جگہ پر اوسکی طرف سے بالکل مطمئن ہو گیا۔ اِس لئے اوس نے پیشگاہِ حجاج میں بذریعہ ایک معروضہ کے سمیہ کے حُسنِ عالم افروز کی اطلاع کی۔ جس کے جواب میں فوراً وہاں سے ایک ضروری فرمان آیا۔ جسمیں اظہار خوشنودی کے بعد اشتیاق و بیقراری کا مضمون تہا۔ اور لکھا تہا کہ جلد سے جلد اوس وحشی اور بڑی آنکھ والی ہرنی کو یہاں پہونچانے کی تدبیر کی جائے۔ تاکہ حسب قاعدۂ شرع رسم عقد عمل میں آسکے۔ اور تمہاری اعلیٰ ترین کارگذاری کا ثبوت پہونچے۔

بہر حال اِس طریقہ سے جب عرفجہ اور حجاج میں اوسنے آمادگی کی روح پہونکدی تو استحکام کی نسبت اور تمہید بطور وعدہ کے طور پر عرفجہ سے ایک رقم مشخصہ کا اظہار کرکے اوسکا نصف عمرو نے عرفجہ کے حوالہ کر دیا۔ نصف بعد عقد دینے کا وعدہ کیا۔ اور عرفجہ سے اوسکی روانگی میں تعجیل کی تاکید کی۔ مگر عرفجہ کو اسکے بعد جو ناگوار موانع اس کار خیر میں تعجیل کے پیش آئے۔ اوسمیں سب سے زیادہ اہم اور اندیشناک خود سمیہ سے اوسکی خوش بختی اور طالع وری کا ذکر آنے پر اوسکا خلاف امید اختلاف بلکہ انکار، بعد ازاں مدینہ میں حسن کا اتفاقی ورود، اور اوس سے سمیہ کے صبر و سکون میں یکایک اضطراب اور اوسکے دبے ہوئے جذبات عشق و شوق

مبارک ہو

امہات الامۃ

شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم مغفور جو بسن کوتاہ میں [illegible] کتب
ہو کر نیست و نابود ہو چکی تھی اور جس کی مطالعہ کا شوق ہر کہ و مہ کو عرصہ سے ہوئے تھا۔
جس کی ایک ایک جلد سو سو روپیہ پر بھی شائقین قیمت دیکر لینے کو تیار تھے اس کا حصہ
اول طبع ہو کر غیر مسلم اقوام کو مفت تقسیم ہو رہا ہے چونکہ اسکی اشاعت کی غرض
زیادہ تر یہ ہے کہ وہ غیر مسلم اقوام میں بکثرت تقسیم ہو تاکہ تعدد ازدواج رسول
مقبول پر جو اعتراضات ہیں انکی اصلاح ہو اور اسلام کی حقانیت انکی ذہن
نشین ہو کر اس مسلمانوں سے توقع کی گئی ہے کہ وہ اسکو خرید کر اس کے حصہ
دوم ترجمہ انگریزی کو مدد دیں تاکہ وہ بھی چھپ کر بکثرت تقسیم ہو سکے کتاب ھذا
کی نسبت کچھ لکھنے پڑنے کی ضرورت نہیں صرف مولانا ئی مرحوم
کا نام کافی ہے کہ وہ کیسی ہو گی حصہ دوم زیر اہتمام حضرت [illegible] اور ترجمہ ڈاکٹر
مشیر الحق صاحب کے ہاتھوں میں اب یہ مسلمانوں کے اختیار میں ہے
اسکی تکمیل جس قدر چاہیں جلد ہو سکتی ہے قیمت بارہ آنہ (۱۲/)
منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجیے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] تارا چند [illegible]

[illegible] اگست و ستمبر [illegible]

تمدن

مشرقی تمدنی ادبی فلسفی اخلاقی تاریخی اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹر [illegible] ایم ۔ اے قاری (علیگ) دہلوی خلف اکبر جناب قاری
[illegible] سرفراز حسین صاحب (علیگ) عزمی دہلوی سیاح جاپان و انگلستان

فہرست مضامین

[illegible] سالانہ مع محصول ڈاک [illegible] (۳۰ اکتوبر تک رعایتی قیمت ہے) فی پرچہ ۴/

[illegible] قاری (علیگ) قیصریہ پریس دہلی میں چھپا
پرنٹر سید علی قادری
مقام اشاعت دہلی

تمدن

دہلی

من درچہ خیالیم و فلک در چہ خیال

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے چنانچہ مذکورہ ذیل عبارت پڑھنے سے ناظرین تمدن پر روشن ہو جائیگا کہ ہم نے کیا سوچا تھا اور کیا ہوا۔ ہم نے رسالہ تمدن کے لکھنؤ میں شائع ہونے کی درخواست ۲۱ ستمبر کو ڈپٹی کمشنر صاحب لکھنؤ کے اجلاس میں پیش کی تھی اور جبھی رسالہ لکھنؤ میں چھپنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ ہماری درخواست ۴ اکتوبر تک منظور ہو کر نہ آئی اور اسی وجہ سے رسالہ کے پرنٹر صاحب اس رسالہ کے چھاپنے سے قاصر رہے۔ اس درخواست کے منظور ہونے کی جلد توقع اس وجہ سے منقطع ہو گئی کہ درخواست کو تفتیش کے لئے دہلی بھیجنا قرار پایا کیونکہ جب پریس میں رسالہ چھپنے کا انتظام کیا گیا تھا وہ دہلی میں تھا۔ اس حالت میں ایک صورت تو یہ تھی کہ ہم اس انتظار میں بیٹھے رہتے کہ جس وقت اجازت آ جائے گی پرچہ شائع کر دیں گے مگر ہم نے یہ گوارا نہ کیا کہ رسالہ کی اشاعت معرض التوا میں پڑ جائے اور ناظرین تمدن اس کے شائع ہونے کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔ مکرمی جناب مولوی عبدالراشد صاحب نے جو الفاظ ہمارے متعلق پچھلے رسالہ میں تحریر فرمائے تھے وہ بھی تاخیر نہ کرنے کی ہدایت کرتے تھے چنانچہ ہم نے دہلی آ کر دہلی سے رسالے کے شائع ہونے کی درخواست دی اور لکھنؤ کی درخواست

کو مسترد کیا۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم دہلی میں منظوری حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ شکر ہے کہ وہ منظور ہو گئی اور ۴ روز کے اندر یہ پرچہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

اب جو کچھ کرنا ہے وہ لکھنؤ سے شائع کرنے کی اجازت حاصل کرنی ہے۔ اور جس وقت وہ درخواست منظور ہو گی اس دن سے رسالہ لکھنؤ سے شائع ہو گا۔ چونکہ ہم رسالے کا دفتر لکھنؤ میں قائم کر چکے ہیں اس وجہ سے دلّی سے وی پی ان صاحبان کے نام نہیں جا رہا۔ جن کا چندہ ختم ہو گیا۔ بلکہ پرچہ بھیجنے کے بعد کارڈ ان کے نام دفتر رسالہ تمدن بل جھاؤ لال لکھنؤ سے وی۔ پی بھیجے جائیں گے۔ امید کہ حضرات اسے وصول فرمائیں گے

تمام خط و کتابت و ترسیل زر دفتر رسالہ تمدن بل جھاؤ لال لکھنؤ کے پتہ سے ہونی چاہئے۔

ہم کو اس معاملہ میں حضرات لکھنؤ سے بہت شرمندگی ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ اہل انصاف خود اس بات کا اندازہ کر سکیں گے کہ ہم کس حد تک معذور ہیں۔ انشاء اللہ عنقریب تمدن کلی طور پر حضرات لکھنؤ کے سایہ عاطفت میں آ جائیگا۔

خاکسار

ایم۔ اے۔ قاری

(دہلی)

"تمدن" کیوں حاضر ہوا ہے؟

یہ رسالہ ان اصحاب کی خدمت میں بھی بھیجا جا رہا ہے جو "تمدن" کی خریداری سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ ان صاحبان کو تعجب ہوگا کہ آخر "تمدن" ان کی خدمت میں کیوں بھیجا گیا ہے؟ "تمدن" ان اصحاب کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوا ہے کہ وہ سابق کی طرح اب بھی اس کی سرپرستی فرمائیں کیونکہ انشاء اللہ اب "تمدن" نہایت باقاعدگی کے ساتھ شایع ہوگا اور سرگرم اصحاب کو جو "تمدن" کی خریداری سے اس لیے سبکدوش ہو گئے تھے کہ وہ باقاعدہ نہیں تھا کم از کم اس قسم کی شکایت نہ ہوگی۔ جو اصحاب ۱۵ نومبر تک خریداری چاہینگے انکو پرچہ سے رہین ملیگا ز اٹی بیٹو

تمدن

دلی کا تمدن لکھنؤ میں

اہل لکھنؤ کو قدرت نے ہمیشہ یہ موقع دیا ہے کہ کوئی لگا لگایا پودا ان کے ہاتھ آگیا اور انھوں نے جان اور مال سے اسکی آبیاری کرنے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پودے کی تاریخ میں جہاں کہیں اسکے لگانے والوں کا نام آتا ہے وہاں حضرات لکھنؤ کے نام کو بھی بہت ممتاز جگہ ملتی ہے۔ زبان اردو دلی میں پیدا ہوئی اور اس وقت جبکہ دلی اجڑی تھی اردو کو ترقی کرنے کا جو میدان ملا وہ لکھنؤ تھا۔ اور جن لوگوں کی نظر کیمیا اثر نے اردو کو زندہ رکھا بلکہ معراج کمال پر پہنچایا وہ حضرات لکھنؤ ہی تھے کم و بیش اسی طرح آج اسی زبان کا ایک رسالہ "تمدن" جو عم مکرم جناب مولانا عبدالراشد الخیری صاحب کی ایڈیٹری میں دلی سے نکلتا تھا بزرگان لکھنؤ کی فراخ حوصلگی اور مہماں نوازی کی توقع پر دلی سے لکھنؤ آتا ہے۔ یہ یاد دلانا بے سود ہوگا کہ یہ اسی

زبان کا ایک ماہواری رسالہ ہے جس کی پرورش میں انھوں نے اسقدر کوشش کی کوشش اہل دہلی کے اہل لکھنؤ بھی بجا طور پر اُردو کے دعویدار قرار دیے جائینگے "تمدن" نے دلّی سے چل کر لکھنؤ تک کی منازل اس امید پر طے کی ہیں جو دلّی کے مشہور شعراء اور خصوصیت سے ساتھ میر تقی تک کو جو دلّی چھوڑنا بمنزلہ کفر خیال کرتے تھے ان پورب کے ساکنوں تک لائی تھی۔ حضرات لکھنؤ سے "تمدن" کے لیے پرورش و اعانت کی توقع کرنا کچھ بہت زیادہ نہیں ہے اسی طرح "تمدن" کا حضرات لکھنؤ کے ساتھ وہی سعادتمندانہ برتاؤ رہے گا جو ایک خورد کا ایک بزرگ اور سرپرست کے ساتھ ہونا چاہیے۔ "تمدن" حضرات لکھنؤ کے مضامین نظم و نثر لکھنؤ کی زبان میں شائع کرے گا۔ اور سعادتمندی سے سرمو تجاوز نہیں کرے گا۔ "تمدن" کے اس نئے دور یا لکھنوی دور کا پہلا پرچہ جناب کی خدمت میں حاضر ہے۔

حضرات لکھنؤ اپنے مضامین بہت جلد بھیجیں نیز وی۔ پی بھیجنے کی اجازت مرحمت فرمائیں اور خریداروں کی فہرست میں توسیع کرنے کی کوشش شروع فرمائیں۔ "تمدن" کا دہلوی دور تو جسطرح بھی ہوا گذر گیا اب امید ہے کہ اسکا لکھنوی دور لکھنوی احباب کی حسن توجہ سے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے گا۔

اس وقت یہ رسالہ لکھنؤ سے سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے (علیگ) و مولانا عبدالراشد الخیری صاحب سابق ایڈیٹر "تمدن" و ایڈیٹر رسالہ "عصمت" اور قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی (علیگ) سیاح انگلستان و جاپان (پرائیویٹ مشنری آف اسلام) کی سرپرستی میں شائع ہوگا اور ان تمام توقعات کو آپ کی ذرا سی نظر عنایت سے پورا کرنے کے

قابل ہو جائے گا جو ایک علمی ادبی رسالہ سے وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

نیاز مند

ایم۔ اے۔ قاری (علیگ)

ایڈیٹر "تمدن"

خلف اکبر قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دھلوی

(علیگ) سیاح جاپان و انگلستان

ریویو

ہندوستان میں اُردو رسالہ جات کی جسقدر ضرورت ہے اس سے ہر اردو داں بخوبی واقف ہے۔ مردوں کے لیے رسالہ جات اتنے کم ہیں کہ اگر اس سے دگنے چوگنے اُردو رسالہ بھی موجود ہوں تو وہ ملک کی وسعت اور آبادی کے لحاظ سے بہت کم ہیں اور طبقۂ نسوان کے لیے تو اس میدان میں ابھی بہت زیادہ گنجایش ہے۔ ہمکو یہ دیکھکر خوشی ہوی کہ کرہل ضلع مین پوری سے ایک اُردو ماہواری رسالہ "پیام امید" نامی ستمبر سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ "پیام اُمید" آزاد بیگم جیسی اہلیہ اظہر علی صاحب آزاد۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) کی ایڈیٹری میں نکلنا شروع ہوا ہے پہلا پرچہ کامل اہتمام سے نہایت شان و شوکت کے ساتھ نکالا گیا۔ اور عمدہ مضمون دیے گئے ہیں۔ لکھائی چھپائی کے اعتبار سے پرچہ بہت عمدہ ہے۔ خدا کرے تم ملک میں سدا بہار پھول کی طرح پھلے پھولے۔ پرچہ کی سالانہ قیمت عہ اور ششماہی قیمت ۱۲ر ہے

مذہب و قومیت

دنیا کوئی نہیں بتا سکتا کہ کہاں سے شروع ہوی تھی ؟ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک پہنچے گی ؟

اس کی نسبت بھی یقینی طور سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ جب شروع ہوی تھی تو اس کی کیا حالت تھی ؟ اور جب ختم ہو گی تو اس کی کیا حالت ہو گی ؟ ہماری نگاہوں کے سامنے کوئی ایسی مکمل تاریخ نہیں ہے جو آغاز عالم پر فیصلہ کن رائے قائم کر سکے ! اس گتھی کو سلجھانے کے لیے جب دماغ انسانی تخیلات کے سمندر بے پایاں میں شناوری کرتا ہے تو ہمیشہ اپنی ذاتی قائم کردہ رخ پر تیرتے ہوے کسی ایک طرف نکل جاتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ اُس نے اس بحر ناپیدا کنار کی ابتدا و انتہا معلوم کر لی ! مذہب کے جہاز میں سوار ہونیوالا اپنے معتقدات کے راستہ پر" آغاز و انجام اپنے مذہب کے موافق دریافت کر لیتا ہے اور اسی پر مطمئن ہو کر اُسے حقیقت سمجھ لیتا ہے ! فلسفہ کے اسٹیمر پر سفر کرنے والا اپنے مفروضات کی راہ پر، ابتدا و انتہا کی نسبت اپنے علم و عقل کے موافق، دماغ فریب استدلال قائم کرتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ اسکی رائے زنی اصلیت کے بالکل قریب ہے ! مگر اصلی حقیقت حقیقت جس پردہ گو مگو میں پہلے تھی، اب بھی رہتی ہے ! فریقین کے مذاہب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ معتقدات ہوں یا مفروضات ۔ آغاز و انجام عالم کی نسبت رائے لگانے والے کے یقین و استدلال میں حصہ غالب ذاتی کیفیت ہے ! جس آب و ہوا اور حالتِ گرد و پیش میں جن سے

واقعی انسانی دماغ کی نشوونما ہوتی ہے۔ انسان نے ہوش سنبھالا اور اپنے خیالات پیدا کیے ہیں؛ اسی کے موافق وہ اس مسئلہ پر بھی رائے زنی کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ بقیہ دنیا بھی ماضیِ غیر محدود اور مستقبل نامعلوم کو اسی عینکِ تخیلات سے دیکھے جس سے وہ دیکھتا ہے! آپ مذہبی عینک سے اگر فلسفہ کے استدلال کو ملاحظہ کریں تو وہ محض لغو نظر آئے گا: اور فلسفہ کے نقطۂ نظر سے اگر مذہب کے معتقدات کا مشاہدہ کریں تو وہ بھی کچھ کم پوچ نہیں معلوم ہونگے!

تہذیب زمانہ کی رفتار کے ساتھ بدلتی رہی اور بدلتی رہے گی! نیک و بد کا مسئلہ۔ ضروریاتِ زندگی کے تابع ہوکر۔ دنیا کی رفتار کے ساتھ ساتھ ایک خاص حد تک برابر رنگ بدل رہا ہے! گویا ماضی سے حال تک معاشرت کا تسلسل' ایک ایسی نہ محسوس ہونے والی زنجیر ہے جس کی ہر کڑی اپنے سے ماقبل والی کڑی سے بالکل ملی ہوئی ہے! فرض کیجیے کہ' اس زنجیر کی ہر کڑی اپنے سے پہلے والی کڑی سے' رنگ کے لحاظ سے' نہایت ہی خفیف حد تک ہلکی ہوتی چلی گئی ہے: اب ایسی زنجیر کے مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ اگر اسکی ایک کڑی بالکل سیاہ ہے تو کم و بیش سو کڑیاں چھوڑ کر آنے والی کڑی' رنگ کے بتدریج ہلکا ہوتے جانے سے' بالکل سفید ہوگی! لیکن اگر آپ اسی سیاہ کڑی کے ماقبل یا مابعد والی متصل کڑی کو ملاحظہ کریں گے تو ان تینوں کے رنگ میں کوئی ایسا نمایاں فرق نہیں پائیں گے جو بادی النظر میں ایک دوسرے میں رنگ کا امتیاز قائم کرسکیں! وجہ یہ ہے کہ رنگ اسقدر خفیف انقلاب کے ساتھ ہلکا ہوا ہے کہ نظر کسی ایک کڑی کا رنگ اس کے ماقبل والی متصل کڑی سے بالکل ملتا جلتا پاتی ہے' البتہ بتدریج ہلکا ہوتے ہوتے دس بیس کڑیوں کے بعد اسکا پتہ چلتا ہے کہ رنگ ہلکا ہوتا جاتا ہے' یہانتک کہ سو کڑیوں کے بعد سیاہ رنگ بالکل

سفید بن جاتا ہے! بالکل یہی حالت معاشرتِ عالم کی ہے! موجودہ سال کی معاشرت کو گذشتہ سال یا آیندہ سال سے مقابلہ کیجیے کوئی بین فرق نظر نہیں آئے گا: البتہ بیس سال پیشتر کی معاشرت سے مقابلہ کیجیے، تھوڑا بہت فرق، غور بین نظر ڈالنے پر ضرور معلوم ہوگا: پچاس سال قبل کی معاشرت کو دیکھیے، آپ فوراً مان لیں گے کہ انقلاب ہو رہا ہے یہانتک کہ ایک صدی میں بالکل دنیا کا پایلٹ ہو جائے گی!

نہیں بتایا جا سکتا کہ معاشرت تہذیب کی پابند ہے یا تہذیب معاشرت کی؟ ممکن ہے کہ دونوں ایک ہی چیز کی مختلف حالتیں ہوں! اس میں شک نہیں کہ ایک دوسرے میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے! دماغِ انسانی ہر نئی چیز کی تلاش و تحقیق میں ہمیشہ سے مصروف چلا آتا ہے: نئی چیز دریافت ہو کر۔ یا ایجاد ہو کر۔ استعمال میں آتی ہے: نئی چیز کا نیا استعمال گرد و پیش کی تمام چیزوں پر۔ یا ان کے طریقۂ استعمال پر۔ اپنے نیچرل تعلق کے لحاظ سے نیا اثر پیدا کرتا ہے: نیا اثر ضروریات میں نیا تغیر کرتا ہے: اس تغیر سے دائرۂ تہذیب میں اسکے موافق انقلاب واقع ہوتا ہے: اور اس انقلاب سے معاشرت کا رنگ متاثر ہو کر تبدیل ہو جاتا ہے!

دنیا آگے بڑھ رہی ہے یا پیچھے ہٹ رہی ہے؟ اس کا جواب بھی دیکھنے والے کے نقطۂ خیال پر منحصر ہے! جو اسکے ساتھ ساتھ متحرک ہے اُسکو بڑھتی ہوی نظر آئے گی: اور جو کسی نقطہ کو ناقابل تغیر سمجھ چکا ہے اُسے ہٹتی ہوی معلوم ہوگی! واقعہ یہ ہے کہ آگے اور پیچھے محض ایسی دو سمتیں ہیں جو انسان کا رخ پلٹ جانے کے ساتھ ساتھ پلٹ جاتی ہیں! مشرق کی طرف مُنہ کرکے کھڑے ہو جیسے مغرب آپ کے پس پشت ہو جائے گا! اور مغرب کی طرف روگردانی

کر دیتا ہے مشرق پیچھے ہو جائے گا! کعبہ مذہب کی طرف منہ کرنے والے کو فلسفہ پس پشت نظر آتا ہے اور فلسفہ کی طرف رخ کرنے والے کو مذہب! اسقدر شاید دونوں فریق مان لیں کہ دنیا۔ آگے بڑھ رہی ہو یا پیچھے ہٹ رہی ہو۔ متحرک اور منقلب ہے!۔

جس رخ اور جس سمت میں دنیا چلی جا رہی ہے۔ اُسی رخ اور اسی سمت کی طرف اُسکی معاشرت بھی برابر چلی جا رہی ہے! رجحان طبع بھی تغیر معاشرت کے ساتھ پلٹتا جا رہا ہے؛ دماغی پسندیدگی و نفرت بھی اسی کے زیر اثر منقلب ہے! گویا تمام عالم جسمانی اور عالم دماغی ایک نا معلوم سمت کی طرف مجنونانہ یا نیچر کے قوانین کے زیر فرمان۔ گام زن ہے!

انسان کی تمام ترقی یا انقلاب اُسکے علم پر منحصر ہے: اور اُسکا علم اُسکی واقفیت اور تجربہ پر مبنی ہے: واقفیت میں اضافہ اسی طرح ممکن تھا کہ حاصل کردہ واقفیت کو۔ جو عرصۂ دراز کی تحقیقات و تجسس کا نتیجہ ہے روزمرہ کی زندگی میں بلا دوبارہ تحقیقات کرنے میں تضیع اوقات کے' آسانی کے ساتھ سمجھ لیا جائے اور باقی زندگی میں اُس میں اضافہ کی کوشش کی جائے! ایک دور لوہے کو کارآمد چیز ہونا معلوم کر لیتا ہے اور یہ علم آنے والے دور کو ورثہ کے طور پر اور چیزوں کے ساتھ ساتھ عطا کر جاتا ہے! دوسرا دور لوہے کے کارآمد ہونے کی تحقیقات کے لیے پھر دوبارہ وقت ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ اس علم کو روزمرہ کی زندگی میں حاصل کرتے ہی اُسکے استعمال میں کوشاں ہو جاتا ہے اور اس سے کارآمد چیزیں بنا ڈالتا ہے؛ اب تیسرا دور اُس علم اولیں اور ان اشیاے ثانیہ سب کو ورثہ میں پاتا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھکر اور چیزیں وجود میں لاتا ہے اسیطرح ماضی کی تحقیقات و ایجادات حال کو ورثہ میں پہنچتی رہتی ہیں اور حال اس علم:

واقفیت میں اضافہ کرکے مستقبل کے حوالہ کرتا رہتا ہے!! نہ صرف ایجادات و اشیا تک ہی یہ علم و واقفیت محدود ہے بلکہ ہر ہر واقعہ میں یہ ہی کیفیت ہے!

حاصل کردہ علم و واقفیت کو آنے والی نسل کے لیے چھوڑ جانے کا نام فنِ تاریخ ہے! ہم معلوم کرتے ہیں کہ بارش جب کبھی ہوی ہے بغیر ابر کے نہیں ہوی ہے اور آیندہ کے لیے ہمارا دماغ مان لیتا ہے۔ یقین کرلیتا ہے۔ کہ بغیر ابر کے بارش ناممکن ہے! ماضی کی تحقیقات عرصۂ دراز تک تجربہ کی کسوٹی پر صحیح اُترنے کے بعد۔ حال کی نسلوں کے لیے بدیہیات کے مرتبہ تک پہنچ جاتی ہے، اور اس سے انکار کرنا بدیہیات سے انکار کرنے کے برابر سمجھا جاتا ہے!

تاریخ ماضی، رفتار زمانہ کا رنگ بتاتی ہے، حال میں اسکے موافق عمل کرکے مستقبل میں خوشگوار یا مفید مطلب نتیجہ کی امید کی جاتی ہے! گویا تاریخ انسانی تہذیب و معاشرت کے انقلاب کا جزو اعظم قرار پائی ہے! تہذیب امروزہ، تہذیب دیروزہ کی پابند ہے اور تہذیب فردا تہذیب امروزہ کی! دنیاے دیروز اگر اپنے تجربات و علم کو نہ چھوڑ جاتی تو دنیاے امروز کو ورثہ میں کچھ نہ ملتا، اور اسی طرح وہ دنیاے فردا کو کچھ نہ دیسکتی! نتیجہ یہ ہوتا کہ دنیاے دیروز جن باتوں کو سمجھ چکی تھی، ان ہی کے سمجھنے میں دنیاے امروز پھر از سرنو کوشاں ہوتی، اور دنیاے فردا بھی اسی گردش میں سرگرداں رہتی! گویا جانور اور انسان کا فرق زائل ہوجاتا!! جانور اپنے تمام عمر کے تجربات کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے لہذا اسکی نسل جس جگہ تھی وہیں کی وہیں رہتی ہے: اور انسان اپنے علم کو ورثہ میں دے جاتا ہے اس لیے اس کی نسل مفید مطلب اضافہ کرلی جاتی ہے!

ہر مسئلہ و ہر شعبۂ زندگی کی تاریخ جس وقت سے انسان نے اسکو درج کرنا شروع کیا ہو۔ حاصل کی جا سکتی ہے: اور اسپر جز رس نظر ڈالنے سے پتہ چل سکتا ہے کہ

وہ خاص چیز اپنے بکار آمد ثابت ہونے کے زمانہ سے اسوقت تک، کسقدر تغیر اور انقلاب کے ساتھ بتدریج پلٹتی ہوی موجودہ صورت تک پہنچی ہے! اسی کو زیرِ غور رکھ کر اپنی و تہار کے رُخ کا لحاظ رکھتے ہوے، آیندہ کے لیے بھی قریب قریب صحیح راے زنی کی جا سکتی ہے!

دنیا۔ غالباً اپنے آغازِ انسانیت سے۔ مختلف حصوں اور فرقوں پر تقسیم چلی آتی ہے! انسان نے اسکو ایسی مصنوعی کوشش کے ساتھ تقسیم نہیں کیا، بلکہ فطرت نے ہی مختلف آب و ہوا کے وجود سے اس تفریق کی بنا ڈالی! انسان نے صرف اُس قدرتی تفریق کے حدود معلوم کرنے اور اسکو بنی نوع انسان کے لیے کارآمد بنانے کی کوشش کی! اختلافِ آب و ہوا، اختلافِ خصوصیاتِ مقامی۔ جنکا اثر جسمِ انسانی اور دماغِ انسانی، دونوں پر مرتب ہوتا ہے؛ اختلافِ رجحانِ طبع، اختلافِ زبان، اختلافِ معتقدات اور اختلافِ طرزِ معاشرت، یہ سب اختلافات انسانی آبادی کی تقسیم و تفریق کا باعث ہیں! ان اختلافات کو یکجا کرکے، اگر جزرس نظر ڈالی جاے، تو معلوم ہو جاے گا کہ تمام اختلافات دو قسم کے ہیں۔ صرف دو قسم کے؛ یعنی:- (۱) مادّی (۲) طبعی یا دماغی! مثلاً اختلافِ آب و ہوا" مادّی اختلاف ہے اور اسکا وجود خارج میں ہے؛ اختلافِ رجحانِ طبع دماغی چیز ہے اور خارج میں اسکا کوئی وجود نہیں!

تاریخِ عالم میں انسان کے معتقدات کی تدریج صورت گیری کو دیکھا جاے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان زمانہ جاہلیت میں ہر اپنے سے طاقتور جسم کو قابلِ پرستش سمجھ لیتا تھا۔ گویا بہ الفاظ دیگر۔ مادّہ پرست تھا! مذہبی پیشوا یا پیغمبراں مذہب اپنے اپنے حسبِ مراتب فلسفۂ مذہب کی تکمیل کے باعث ہوئے اور انسان مادہ سے ہٹ کر روح کی طرف چلا! مختلف خداؤں کو پوجتے پوجتے وہ وحدانیت کی لاثانی

حد تک جا پہنچا! یہ گویا روحانیت کی تکمیل تھی! اب مادہ پرستی نے روحانیت کے آگے سر جھکا دیا اور معتقدات و معاشرت۔ تمام تر۔ روحانیت کے سانچے میں ڈھل گئیں! اس دور کے بعد فلسفۂ جدید نے مادّہ کی تحقیقات و تجسس میں سرگرم رہ کر، پرانے خیالات کو ایک خوبصورت جامہ پہنا دیا کہ عملی زندگی کا مشاہدہ؛ اس ترقی مادہ سے روحانیت آمیز معاشرت کو متاثر پانے لگا! اب پھر معاشرت روحانیت کے بجاے مادّیت کی طرف منتقل ہوی! گویا موجودہ زمانہ۔ مذہب کی صورت میں نہیں بلکہ فلسفہ اور سائنس کی صورت میں۔ مادّیت کا زمانہ قرار پایا!

بتایا جاچکا ہے کہ دنیا مادّی اور دماغی اختلافات کی بنا پر ہمیشہ سے منقسم چلی آتی ہے! اس تقسیم پر انسانی معاشرت کا رنگ برابر چڑھتا رہا ہے۔ اور غالب رہا ہے! روحانیت کے زمانے میں جبکہ تمام تر معاشرت میں روحانی عنصر غالب تھا، تقسیم نوعِ انسان بھی اُسی عنصر کے لحاظ سے کی گئی تھی! روحانیت ایک دماغی کیفیت ہے، خارج اسکے وجود سے مبرّا ہے! تقسیم آباری بھی جس بنا پر کی گئی، روحانی۔ یا دماغی۔ تھی اور خارج اسکے وجود سے بھی مبرّا تھا! یہ بنا جس پر دنیاے قدیم نے تقسیم نوعِ انسان کی عمارت چُنی، مذہب تھا: ساری دنیا مختلف معتقداتِ انسانی کے لحاظ سے مختلف گروہوں میں تقسیم ہوگئی: ہمدردی، اتفاق، اخوت وغیرہ وغیرہ۔ معاشرت و تقسیم کے زیر اثر۔ یکسانیت معتقدات پر منحصر ہوگئیں! نتیجہ۔ یہ الفاظِ مختصر یہ تھا کہ۔ نوعِ انسان اپنے تمام نیچرل جذبات کو معتقدات کا تابع فرمان بنا کر مذہب کے لحاظ سے تقسیم ہوگئی! اختلافِ مذہب نفرتِ باہمی کا باعث قرار پایا اور اتفاقِ مذہب اتفاقِ معاشرت و تمدن کا مرکز ٹھہرا! دنیا میں مسلمان، عیسائی، یہودی، ہندو وغیرہ وغیرہ مختلف دائرے قائم ہوگئے!

فلسفہ وسائنس کی ترقی نے بعد میں مادیت کو پھر زندہ کردیا! نئے نئے اختراعات روزانہ مشاہدہ میں رہکر اور بکار آمد ثابت ہوکر معاشرت کو اپنے رنگ میں رنگنے لگے: تہذیب وتمدن پر۔ عملی زندگی میں۔ مادیت غالب ہوچلی اور اسی وجہ سے تقسیم بنی نوع انسان پر بھی اسکا اثر مرتب ہوا! معاشرت کا مرکز روحانی۔ مادی خاب اختیار کرنے لگا اور زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے والی دنیاے مغرب نے بجاے مذہب کے قومیت کو تقسیم نوع انسان کی بنیاد قرار دیا! اختلاف معتقدات کے بجاے اختلاف آب وہوا یا اختلاف خصوصیات مقامی۔ اختلاف باہمی کا مرکز قرار پایا! "خاص آب وہوا اور خاص حدود ملک میں پیدا ہونا اور نشو نما پانا" بنیاد اخوت وہمدردی یا مرکز اتفاق و یکجہتی ٹھہرا! تمام جذبات قومیت۔ یا بالفاظ دیگر مادیت کے رنگ میں رنگ گئے اور دنیاے جدید قومیت اور ملکیت میں تقسیم ہوگئی! قومیت کے مختلف دائروں کے نام تاریخ قدیم میں بھی موجود تھے مگر اُس زمانے میں وہ محض ملکی اعتبار سے استعمال کیے جاتے تھے اور انکو کوئی خاص اہمیت نہیں دیجاتی تھی! فرانسیسی ہونے پر۔ یا امریکن ہونے پر اتفاق کا دارومدار نہیں تھا، بلکہ جذبات ویکجہتی کا تعلق مذہب سے تھا! فرانسیسی وامریکن وغیرہ محض ملک ظاہر کرتے تھے اُن سے کوئی خاص حُبِ قومیت متعلق نہیں تھا! مگر اب تمامتر اتفاق واخوت فرانسیسی یا امریکن وغیرہ ہونے پر مبنی ہوگیا اور تمام جذبات اس احساس قومی کے تابع فرمان بن گئے! گویا قدیم اعزاز مذہبی نے معمولی مذہبی حیثیت اختیار کرلی اور قدیم معمولی لقب ملکی نے معزز ترین احساسِ قومی کی جگہ لے لی!

اس میں شک نہیں کہ مذہب کی بنا معتقدات دماغی پر ہے، جبکا کوئی ذاتی وجود خارج میں نہیں: اور قومیت کا دار مدار خاص حدود جغرافیائی اور خصوصیت آب وہوا پر ہے، جنکا وجود سرتاپا خارج میں ہے! تقسیم قدیم۔ اسی لحاظ سے۔

ایک ایسی تقسیم کی جاتی ہے جسکا دار و مدار محض معتقدات دماغی پر ہے اور جس کا مادی وجود خارج میں قطعی نہیں، علےٰ ہذا۔ تقسیم جدید ایک ایسی تقسیم سمجھی جاتی ہے جو مادی اصول پر مبنی ہے اور جس کا تعلق نیچرل اختلافات کے قواعد پر ایسی چیزوں سے ہے جو مادّی ہیں اور خارج میں ہر وقت موجود ہیں! استدلال جدید کہتا ہے کہ قدیم طریقۂ تقسیم نہایت ناقابل اعتبار و غیر مستقل ہے اور جدید طرزِ تقسیم ناقابل تغیر و مستحکم ہے! وجہ۔ نہایت مختصر الفاظ میں۔ یہ بیان کی جاتی ہے کہ معتقدات دماغی نیچر کے پیدا کردہ قوانین کے ہمرنگ نہیں ہیں۔ اور جو چیز قوانین قدرت کے ہمرنگ نہ ہو اس مادی عالم میں قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لیے غیر مستقل ہیں: ایک عیسائی ایک منٹ میں مسلمان ہو سکتا ہے اور ایک مسلمان ایک لمحہ میں عیسائی گویا منقسمہ دنیا کے ایک دائرہ سے فوراً دوسرے دائرہ پہنچ سکتا ہے، اس لیے یہ تقسیم نہایت ناقابلِ اعتبار ہے: ساتھ ہی معتقدات کا کوئی وجود خارج میں نہیں چل سکتا کہ کسی خاص شخص کے معتقدات میں کوئی تغیر اندر ہی اندر تو واقع نہیں ہو گیا؟ برخلاف اسکے، جدید طرزِ تقسیم قوانینِ قدرت کے پیدا کردہ اختلافات پر مبنی ہے اور جبتک وہ قوانین ہی تبدیل نہ ہو جائیں یہ تقسیم بھی نہیں تبدیل ہو سکتی ایک شخص فرانس میں محض قدرت و اتفاق کے حکم غیر مرئی کے بدولت، بلا کسی اپنی ذاتی رائے کے۔ پیدا ہوتا ہے اور نشوونما پاتا ہے، اب وہ کہیں جائے، کہیں رہے کوئی مذہب اختیار کرے، لیکن تادمِ آخر فرانسیسی ہی رہے گا اور فرانسیسی ہونے کو فی الواقعی، وہ کسی طرح اور کسی حالت میں اپنے ذات سے الگ نہیں کر سکتا! گویا قومیت ایک ناقابلِ انفصال اتفاق ہے! اور قومیت پر مبنی ہونے والی تقسیم۔ اسی وجہ سے۔ نہایت مستحکم اور مادی چیز ہے! مجھے اس جگہ اس بحث سے مقصود نہیں کہ دنیا کی آبادی کو پرانے رنگ میں تقسیم کیا جانا زیادہ

موزوں ہے یا نئے رنگ میں ؟ واقعات کا من وعن بیان کردینا اور رائے زنی کو ہر شخص کے نقطۂ نظر کے موافق، اسی کے دماغ پر چھوڑ دینا۔ میری رائے میں بہترین طریقہ ہے!

دنیائے مغرب زمانے کے ساتھ ساتھ چلتی رہی، مادیت کے سانچے میں ڈھلتی رہی، اور مذہب کو صرف روحانی جگہ دے کر، معاشرت اور عملی زندگی کو مادیت کے رنگ میں رنگتی رہی! معاشرت کے ساتھ ہی ساتھ تقسیم دنیائے مغرب بھی حد بہ اصول قومیت کے لحاظ پر مبنی ہوگئی اور مذہب کے بجائے قومیت نے مغرب کی آبادی کو مختلف حصوں میں تقسیم کردیا اس تقسیم کا عنصر تمام جذبات انسانی پر اسقدر غالب آیا کہ آج قومیت پر لاکھوں جانیں فخر کے ساتھ نثار کی جارہی ہیں! گویا مغرب نے عملی زندگی میں زمانے کا ساتھ دیا۔ اور مذہب کو روحانیت کے دائرۂ دماغی تک محدود کرکے معاشرت کو اس کے حلقۂ اثر سے نکال لیا!

سلطان حیدر جوش (علیگ)

"بغیر خلوص کے کوئی انسان کبھی بڑا آدمی (قابل وقعت) نہیں ہوسکتا اور نہ وہ عظیم الشان کام کرسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بہت ہوشیار آدمی ہو۔ لوگوں کو بہت محظوظ کرسکتا ہو اور بہت مشہور ہو مگر اس کو سنجیدگی کی ضرورت ہوگی۔ اور جب وہ بڑا آدمی ہوسکے گا۔

رسکن"

حضرتِ انسان

حضرت انسان کے مسئلہ پہ غور کرنے کے لیے دنیا پر بھی نظر ڈالنی ہے۔
دنیا کب قائم ہوئی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جسکا تشفی بخش جواب ملنا ناممکنات سے ہے۔ اگر انسان کے اُس قلیل التعداد طبقے کو چھوڑ دیا جائے جو اپنی قوت متخیلہ کے بل پر بہت کچھ اُچھلتا کودتا ہے اور اُسکے زعم میں اپنے آپ کو کسی عقیدہ کا پابند نہیں مانتا اور جس وقت جو کچھ اسکے خیال میں آجاتا ہے اسکو خود ماننا تو ایک طرف دوسروں سے بھی متوقع ہوتا ہے کہ اسکا تتبع کریں مگر دنیا کی وہ آبادی جو اپنی قوت فہم کو اسقدر صحیح نہیں سمجھتی کہ اپنی ہادی خود ہو سکے اور جس نے کسی نہ کسی مذہب کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیا ہے دنیا کی اس دہریہ پنے کی بحث سے کہ دنیا کیونکر بنی؟ آیا اسکو اس صورت سے جس میں کہ یہ آج ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہے آسمان پر سے حضرت آدم کی طرح کسی جرم کی پاداش میں "دنیا" بنا کر پھینک دیا گیا؟ یا اس ضرورت سے پیدا کیا گیا کہ حضرت آدم کو یہاں بھیجنا مقصود تھا؟ یا خدا کو نہ ماننے والے ہم ہی جیسے انسانوں کے خیال کے مطابق دنیا کی موجودہ شکل (زمین موجودہ شکل کہنے میں غالباً غلطی کرتا ہوں کہ ہر زمانے میں اسکی موجودہ شکل کچھ اور ہی خیال کی گئی اور آج کون اس امر کا مدعی ہوسکتا ہے کہ دنیا کے گول ہونے کا آج کا دعویٰ کل دنیا کو مثلث نہ ثابت کردے گا۔) آپ سے آپ پیدا ہوگئی۔ کیونکہ عناصر تو موجود تھے ہی ان کی مختلف حرکتوں سے مختلف صورتیں پیدا ہوتی گئیں اور انکے عقیدہ کے مطابق بھی یہ بہت کچھ ممکن ہے ان ہی ابتدائی یا بنیادی عناصر کی مزید حرکت سے

آج جو شکل بیان کی جاتی ہے کل وہ نہ بیان کی جائے اپنے آپکو بالکل علحدہ رکھتی ہے اور اس قسم کے خیالات کو مہمل جانتی ہے مذاہب کے پابند لوگوں نے تو اس فضول بحث کو بہت کچھ چھوڑ کر دنیا کی ابتدا اُسی وقت سے مانی ہے کہ حضرت آدم آسمان پر سے ایک مقام پر وارد ہوئے جو زمین اور اسکے بعد اور اب تک دنیا کے نام سے موسوم ہوی۔ ڈاروِن اور ان کے طبقہ کے دوسرے لوگوں کو تو قدرتاً اس سے بھی اختلاف ہونا چاہیے کیونکہ دنیا کے اکثر مذاہب تو اشرف المخلوقات انسان کا وجود حضرت آدم سے ہی مانتے ہیں مگر ڈاروِن صاحب جو ترقی کے اصولوں سے ہماری نسبت زیادہ واقف معلوم ہوتے ہیں انسان کے وجود کی بنیاد تو خبر نہیں کہاں سے مقرر کریں گے مگر وہ شکل انسانی کی انسان ہونے سے پہلی منزل کا پتہ تو بندر سے دیتے ہیں۔ اگر ڈاروِن صاحب کے قول کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ بندر کا وجود بندر کی ہی ذات سے ہو اگر اسی طرح بندر کا وجود کسی اور چیز یا جانور سے قرار دیا جاے اور اس طرح ایک دوسرے کے وجود کے متعلق ڈاروِن کے خیالِ دوربین کو کام میں لاکر تحقیق کی جائے تو انسان کا وجود خدا جانے کہاں سے نکلے گا اور خدا جانے کچھ وجود کی بنیاد نکلے گی بھی یا نہیں آگے چل کر اسکے متعلق بھی یہ ہی کہا جائے گا کہ بعض عناصر نے مل کر یہ شکل اختیار کی غیر کچھ بھی ہو ہم تو انسان اور دنیا کی ابتدا اُسی وقت سے کرتے ہیں جب سے حضرت آدم دنیا میں تشریف لائے۔ حضرت آدم کے ساتھ ہی حضرت حوا کو بھی مسلمانوں اور بعض سماوی مذاہب کے اعتقاد کے مطابق جنت سے نکالا گیا تھا چنانچہ اس مقام پر دونوں کو گرایا گیا جسکو آج ہم دنیا کہتے ہیں گو اس وقت دنیا کی حد بہت تھوڑی ہوگی اور خبر نہیں اس وقت اس خطۂ زمین پر کس لفظ کا اطلاق ہوتا ہوگا۔ غرضکہ جب خلد سے نکلنے کے بعد دوسرے خطہ میں حضرت

آدم اور حوا کی ملاقات ہوی اور اس وقت سے دنیا نے اپنا وہ دور شروع کیا جس پر ہمیں نظر ڈالنی ہے۔

چونکہ دنیا صرف آدمی اور زمین پر مشتمل نہیں ہے اسلیے بظاہر ہم نے جو لفظ دنیا استعمال کیا ہے اسکے لیے ہم کو دنیا کی کل موجودات پر ایک نظر ڈالنی چاہیے مگر ہم اپنے اس مضمون میں چونکہ انسان اور اسکی مختلف ترقیوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں اس لیے صرف انسان یا آدمی کا زمین پر آنا اور پھر مختلف حالتوں کا پیدا ہونا وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو اس وقت پیش نظر ہیں۔ باقی دنیا کی موجودات سے گو ہم اسوقت بحث نہ کریں مگر ہم انکے وجود کو نظر انداز کرکے پورے طور پر اپنا کام نہیں نکال سکتے۔ دوسرے یوں بھی دوسری موجودات کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ انھوں نے کوئی ترقی فی نفسہٖ نہیں کی۔ یا یوں کہیے کہ خدا نے اشرف المخلوقات قرار دینے میں یہ ہی رمز رکھی تھی کہ انسان کو کامل جانور ہونے کی تمام بلکہ ضرورت سے زیادہ قوتیں دیدی جائیں مگر کمال پر پہنچنے یا کامل جانور بن کر پھر انسان کہلانے کے لیے اسکو خود اُن قوتوں کو استعمال کرنا پڑے۔ اگر خدا نے ایک طرف دوسرے حیوانات کی طرح انسان کے لیے زندگی کے تمام کلیے قائم کرکے اسکو دوسرے حیوانوں کے برابر نہیں کیا تو دوسری طرف اُسکو وہ فہم و ادراک مرحمت کیا جو انسان کو کامل بنائے اور اسکو دنیا کی موجودات میں سب سے افضل رکھے انسان کو خود انسان بننے کی جو قوت دی گئی ہے (عقل۔ضمیر وغیرہ) وہی وہ چیز ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات کہلوایا۔ اگر انسان اپنے تمام کاموں اور انتظاموں کو جانوروں کے انتظامات کے برابر بھی مکمل نہ کر سکے تو وہ دراصل اس لقب سے ملقب نہیں کیا جا سکتا جو اسکے لیے تجویز ہوا ہے۔

ظاہرا طور پر نظام قدرت یا عالم موجودات میں جانوروں کا انتظام مکمل ہوتا ہے

اگر آپ صرف چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں ہی کے انتظام پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کا انتظام ہم انسانوں کے انتظام سے زیادہ مکمل ہے اسکے علاوہ ایک جانور ہرگز اس چیز پر مُنہ نہ ڈالے گا جو اُسکے لیے قدرت نے ممنوع نہیں کی مثلاً اگر آپ ایک گدھے سے اس امر کے متمنی ہوں کہ وہ کتے کی طرح گوشت کھانے لگے تو یہ گدھے کے لیے اتنا ہی ناممکن ہے جتنی اس عالم موجودات کی سب چیزیں انسان کے لیے ممکن ہیں میرا اس سے یہ مقصد تھا کہ خدا کا انسان کو بنا کر اسکو اشرف المخلوقات قرار دینے سے یہ مطلب تھا کہ وہ خود اپنے فہم اور ادراک سے جو اسکے شرف کی جڑ ہیں "کچھ نہیں" سے "سب کچھ" بلکہ "سب کچھ" سے بھی "افضل" بن کر اپنے تئیں سب موجودات میں ممتاز بنائے۔ سب پر حکومت کرے۔ دنیا اور اسکی کل کائنات کو اپنے تابع رکھے اور آپ پہلے کامل حیوان بنے یعنی اپنے میں ان تمام انتظامات کو مکمل کرے جو خدا نے دوسرے جانوروں کے لیے بدرجۂ احسن کیے ہیں اور اسطرح ان جانوروں سے ممتاز ہو کر دنیا کی تمام چیزوں پر قبضہ جمائے۔

کوئی چیز دنیا میں کسی دوسری چیز سے افضل اُسی وقت کہلائی جاسکتی ہے جس وقت وہ اپنے میں تمام وہ خوبیاں بھی رکھتی ہو جو اس چیز میں موجود ہیں جس سے برتر اسکو بننا ہے اور اسکے علاوہ اسمیں کچھ اور زیادہ خوبیاں ہوں اب انسان کے وجود سے اس کی ترقیوں کی طرف رجوع کیجیے۔

دنیا کی تاریخ بتاتی ہے اور اسکے علاوہ بعض حالات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان پہلے ننگا رہتا تھا جو ملتا تھا اسے کھا لیتا تھا۔ جانور کیا جانور سے بھی بدتر تھا۔ اس وقت تک دنیا میں بعض مقامات پر ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو ترقی کے اُسی درجے پر ہیں جو قدرت نے ان کو عطا کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے ترقی کی اسکے ایجاد کرنے والے دماغ نے

بار بار ٹھوکا دے کر اسکو بتایا کہ تو اس لیے نہیں پیدا ہوا کہ یہاں کا یہیں رہ جائے بلکہ تو ترقی کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد جو انسان کی شکل نظر آئی تو اسکے ستر کی جگہ پتے بندھے ہوے ہیں اسکے ہاتھوں میں نوکدار پتھر ہیں اب وہ انسان کو نہیں کھاتا بلکہ موجودات میں سے دوسری اقوام کے جانداروں کو مثلاً چرندوں پرندوں کو ان پتھروں کی نوکوں سے کاٹ کر کھاتا ہے پھر تاریخ کے کچھ اوراق اُلٹے اور دو تین کیا بلکہ کچھ زیادہ صدیوں کا غوطہ دے کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت انسان ہیں تو ویسے ہی مگر اب ان کو یہ خیال پیدا ہو چلا کہ کچا گوشت کھانا ٹھیک نہیں اسکو دھوپ میں سکھایا مگر اس سے کچھ اسکا مقصد پورا نہیں ہوا اور اس وقت قدرت نے قاصر بندے کی مدد کی اور ایک دن حضرت انسان نے ایک جانور کو مارنے کے لیے زور سے پتھر جو پھینکا تو وہ اس جانور کے لگنے کے بجاے دوسرے پتھر سے ٹکرا گیا اور اس سے ایک روشنی پیدا ہوگئی روشنی نے پیدا ہوتے ہی ترقی کی اور اُس گھاس کو جو اس پتھر کے قریب تھی اپنے زیر اثر کرلیا انسان یہ ماجرا دیکھکر بہت تعجب میں ہوا پہلے تو دور سے تماشا دیکھا پھر وہاں سے بھاگ کر اس روشنی کے اکھاڑے میں کود ہی پڑا پہنچتے تو پہنچ گیا مگر جاتے ہی جو گرمی لگی تو پریشان ہوا اور واپس بھاگنے لگا واپس پہنچتے پہنچتے آپ کے سب بال وغیرہ جل گئے اور تمام بدن میں بےحد سوزش پیدا ہوگئی ۔ مگر آپ کو اس سے یہ ضرور معلوم ہوگیا کہ اس سے گوشت ضرور پک جائے گا۔

کئی صدی بعد جو دیکھتے ہیں تو وہ ہی انسان صاحب کھال منڈھے ہوے تشریف فرما ہیں پتھروں کا چولہا بنائے ہوے مٹی کی ہنڈیا میں کچھ پکا رہے ہیں اور اب آپ اکیلے نہیں ہیں آپکے طبقے کے کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ غرض اسطرح

ترقی کرتے کرتے حضرت انسان آدمیوں میں داخل ہو گئے جب کھانے پینے ساتھ رہنے سہنے کا مزا پڑ گیا جانوروں کے مارنے کے لیے تیر کمان بنا چکے تو آپ کی بلند پروازی نے اور رنگ دکھایا اور کچھ دنوں بعد آپ شہر میں رہتے ہوئے عمدہ عمدہ پوشاکیں زیب تن کیے ہوئے بندوقیں ہاتھوں میں لیے ہوئے نظر آئے اور ایک اور صلاحیت بھی آپ میں دکھائی دی کہ آپ اپنے ہم جنسوں میں سے ایک کو اپنے اوپر حکومت کر لینے دیتے ہیں۔ گھوڑے ہاتھی آپ کے تابع ہیں تمام جانوروں پر آپ کو قدرت ہے کڑوے تیل کے چراغ گھروں میں روشن ہیں اب حضرت انسان جھونپڑوں اور درختوں کے نیچے جانوروں کی طرح بسیرا لینے کی جگہ سی اینٹ کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ قوموں سے لڑتے ہیں جھگڑتے ہیں ایک دوسرے کو مار بھی ڈالتے ہیں مگر ان سے اگر یہ کہو کہ فلاں پرستان میں ایک پری ایک گاڑی میں بیٹھ کر تمام دنیا کی سیر کر آتی ہے مگر اس گاڑی میں نہ گھوڑا ہے نہ ہاتھی نہ کوئی اور جانور اور اسکے محل میں تمام چراغ آپ ہی آپ روشن ہو جاتے ہیں اور ان چراغوں میں نہ تیل جلتا ہے نہ وہ چراغ موم بتی کی شکل کے ہیں تو حضرت انسان کہنے والے کے لتے لے ڈالتے ہیں اگر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہوائی تخت کا ذکر کرو تو آپ چونکہ کچھ صدیوں کے بعد مذہب کے پابند ہو گئے ہیں اعتقاد کے خیال سے ہاں تو کہہ دیتے ہیں مگر یقین نہیں آتا۔

ان ہی انسان کو ایک صدی بعد دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ریل میں سوار موٹر میں سوار اور سب سے زیادہ ہوائی جہاز پر سوار نظر آتے ہیں اور بعض تو یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ ممکن ہے کہ حضرت سلیمان کے زمانے میں بھی لوگوں کو اتنی زیادہ انجنیری آتی ہو کہ انھوں نے ہوائی جہاز کے نمونہ کا تخت

بنا لیا ہو۔ بعض بچارے اب بھی اعتقادات کی بندش میں جکڑے ہوئے ہیں اور چپ ہیں۔ دیکھتے سب کچھ ہیں مگر بولتے نہیں۔ اس وقت بھی اگر آپ سے کوئی یہ کہنے لگے کہ میاں توپ بندوق کو چھوڑو ہم تم کو ہوا کا ایک میگزین دیتے ہیں جس سے سب مرجائیں گے تو یقین نہیں آتا مگر ایک دس برس کے بعد یہ ہی حضرت انسان خود لوگوں کے مارنے میں ہوا استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ایک مقام سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر گولہ پھینکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب یہ لوگ اسقدر بد اعتقاد یا بھولے نہیں رہے اب تو ان کو امریکہ کے مشہور سائنس داں کے یہ کہنے کا یقین آجاتا ہے کہ سائنس اور انسان دونوں موجود ہیں اور ان دونوں کے موجود ہونے کی حالت میں معلوم ہوگا کہ دنیا میں کیا کیا ایجادیں ہوتی ہیں اور آج کی چیزیں تم کو کل کی چیزوں کے آگے اتنی ہی ہیچ معلوم ہوں گی جیسے موٹر کے آگے پرانے زمانے کی شکرم۔ اب ان کو یہ کہنے کا بھی یقین آجاتا ہے کہ اس نظام عالم میں ایک نہیں بہتیری دنیائیں ہیں چنانچہ مریخ سائنس میں ہماری دنیا سے اسقدر آگے ہے کہ وہ ہم سے رسل و رسائل کا سلسلہ جاری کرنا چاہتا ہے مگر ہم اسکے پیغامات سمجھنے اور حاصل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ (باقی آئندہ)

(ایڈیٹر)

خط و کتابت

جو صاحب اب "تمدن" کے متعلق کسی قسم کی خط و کتابت کریں۔ پرچہ بھیجنے یا نمونہ بھیجنے کی ہدایت کریں یا مضامین بھیجیں وہ خاص طور پر اس امر کا خیال رکھیں کہ اب رسالہ "تمدن" کا دفتر پل جھاؤ لال لکھنؤ میں ہے۔ جو صاحب "تمدن" کے سابقہ پتہ پر خط و کتابت کرینگے اُنکی تعمیل نہونے کی شکایت کی تلافی ہمارے امکان سے باہر ہے۔ ایڈیٹر

فلسفہ راز و نیاز

(۱)

نظام عالم میں سب سے زیادہ قابل قدر انسان کا وجود ہے جسمیں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ حیات انسانی کے کسی ایسے پہلو کو مکمل نہیں کہہ سکتے جس میں اولاً فرداً فرداً مرد اور عورت سے اور ثانیاً مجموعی طور پر مرد عورت یا عورت۔ مرد کے مسئلہ پر غور نہ کی جائے۔

مرد اور عورت پر علیحدہ علیحدہ بحث کرنے میں یہ لازم آئے گا کہ مرد کی صفات اور خصوصیتیں علیحدہ بیان کی جائیں اور عورت کی صفات اور خصوصیتیں علیحدہ۔ دونوں کے مخلوط مسئلہ کے یکجا مطالعہ میں واضح طور پر بیان کرنا ہوگا کہ کون کون سی صفات اور خصوصیات دونوں میں مشترک ہیں اور یہ کہ

(۱) جانبین کی مشترک صفات اور خصوصیات کے ایک جگہ جمع ہونے سے ان میں کیا جلا ہوتی ہے

اور (۲) غیر مشترک صفات اور خصوصیات کے ایک جگہ جمع ہونے سے علیحدہ علیحدہ مرد اور عورت پر کیا اثر ہوتا ہے۔ انجام کار یہ دیکھنا ہوگا کہ اس اختلاط اور معجون مرکب سے مجموعۂ حیات انسانی کس کس طرح اور کس درجے تک ترقی یاب ہوتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ مرد اور عورت کے فطری تعلق اور اتحاد سے جسمانیات دماغیات قلبیات اور روحانیات کے عالموں میں کیا کیا تحریکیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان تحریکوں کے نتائج ترقی عالم کے

اہم مسئلہ میں کہانتک حصّہ لیتے ہیں۔

(۱) نفس مضمون پر بحث کرنے سے پہلے جسمیں زیادہ ترکیبات انسانی سے بحث کرنی ہوگی اور جن کو ہم آئندہ باطنیات سے تعبیر کریں گے ہم کو بیرونیات پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے۔

تو ام بیرونیات ایک پہلو سے مجموعہ محاسن ہے ہرطرف حُسن ہی حُسن ہے زمین پر شجر حجر پھول پتے۔ دریا۔ پہاڑ اور بے شمار رنگین اور پُر بہار اشیاء، جنمیں معدنیات بھی شامل ہیں ایک لاانتہا حُسن کے سلسلہ کو قائم کرتی ہوی نظر آتی ہیں۔ چرند۔ پرند۔ دریائی جانور درندہ۔ سانپ بچھو۔ حیات عظیم کی بے مثل کڑیاں ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اوپر نظر کرو تو آسمان اپنے چاند سورج۔ تاروں اور مختلف شواہد قدرت کے ساتھ کوس لمن الملک بجارہا ہے اسکی دنیا کیا بیشمار دنیائیں بالکل علیحدہ ہیں اور حیات عظیم میں تکمیلی ضرب دینے کی مدعی معلوم ہوتی ہیں۔ موسموں کا تغیر تبدل بذات خود ایک دلچسپ سماں ہے مگر جب اسکے جلو میں مختص الموسم نباتات میوے ترکاریاں وغیرہ حساب میں لگائی جائیں تو ایک علیحدہ علم ہوجاتا ہے۔ ان سب شواہد قدرت کی جان شکل وصورت رنگ روپ چھٹائی بڑائی۔ موٹاپن دُبلاپن اور ان سب کی اصل گولائی حُسن کی الف۔ب۔ت ہے۔

اس وسیع دائرہ حُسن میں انسان جو خود بھی بدرجۂ غایت حسین ہے قرار گزین ہے۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جب اسکے بیرونیات اسقدر حسین ہیں تو اس کے باطنیات اس سے کم حسین ہوں گے۔

(۲) حسن وجمال کے متعلق عقلا نے مختلف کلیئے قائم کیے ہیں۔ غالب رائے یہ ہے کہ خلاق عالم جمال مطلق ہے اور اسی کا ایک ادنی جلوہ کائنات میں

ظہور پذیر ہے۔ اس لیے شواہد قدرت کے جمال کو انتہائے جمال سمجھنا غلطی ہے۔ بلکہ ادراک جمال قلب انسانی کو اُس حالت میں حاصل ہوتا ہے جب وہ محسوسات سے گذر کر روحانی سکون حاصل کرتا ہے۔ مگر بغیر شکل وصورت رنگ و روپ کے جمال کا مفہوم مرتب نہیں ہو سکتا۔ اسمیں بھی صرف یہ دقت ہے کہ شکل وصورت رنگ و روپ کے ساتھ خواہش اکثر وابستہ ہو جاتی ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہش قوائے مدرکہ کو اپنی خدمت میں مصروف کر لیتی ہے۔ اور اسی شکل و صورت اور رنگ و روپ میں جو جمال مطلق جلوہ گر ہوتا ہے اسوقت تک قوائے مدرکہ کو نہیں پہنچنے دیتا اور چونکہ نیکی۔ علم اور جمال (یا بعضوں کے نزدیک صدق جمال اور نیکی) آپس میں نہایت رابطہ اور اتحاد رکھتے ہیں۔ اس لیے جمال کے صحیح ادراک میں جسقدر نقص رہ جائے گا اسقدر نیکی اور علم یا صدق اور نیکی میں بھی کمی رہ جائے گی۔ لہذا جمال حقیقی کی تلاش انسان کو مجموعۂ محاسن بناتی ہے۔

ان سب باتوں کو مان لینے کے بعد صرف ایک ایسے فلسفہ کی ضرورت باقی رہتی ہے جو حُسن ظاہری سے خواہشات نفس کو دائمی طور پر وابستہ نہ رہنے دے بلکہ جس کے ذریعہ سے قلب انسانی جمال حقیقی کی طرف ہدایت پائے یا یوں کہیے

حُسن سے مرد اور عورت جو حُسن ظاہری کے بہترین نمونہ ہیں ایک دوسرے کے حُسن سے متاثر ہو کر ایک دوسرے کی کیفیات قلب کو سمجھکر جمال حقیقی اور زندگی کے اعلےٰ مدارج کی طرف ترقی کریں اس فلسفہ کا نام ہم نے فلسفۂ راز و نیاز رکھا ہے جو ہمارے اس مضمون کا عنوان ہے۔

(۴) اب ہم (جیسا اس مضمون کے شروع میں ظاہر کیا گیا ہے) مرد اور

عورت کی صفات اور خصوصیات سے بحث کرتے ہیں۔ اس بیان میں فلسفیانہ پیچیدگیوں میں جانا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ جہانتک ممکن ہوگا اسکو سہل کیا جائیگا
(۲)۔ جیسا کہ اسکی ساخت سے ظاہر ہے۔ مرد زیادہ محنت کرنے زیادہ تکلیف برداشت کرنے۔ معاش اور ترقی کی تدابیر عمل میں لانے۔ جلب منفعت اور دفع مضرت کے سامان فراہم کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔
(ب) عورت محنت اور تکلیف کو سمونے اور خوشگوار بنانے۔ سامان ترقی کو سلیقہ سے برتنے اور جلب منفعت اور دفع مضرت کی تدابیر میں اعتدال اور میانہ روی پیدا کرنے کے لیے ہے۔

اس اعتبار سے مرد کو زندگی کی نثر اور عورت کو زندگی کی نظم کہنا بیجا نہوگا۔

آگے چلیے تو مرد اپنی شجاعت لیاقت دولت وغیرہ کی داد طلب کرنے کا قدرتاً مریض معلوم ہوتا ہے۔ یا بہ تبدیل الفاظ عزت اور فضیلت طلب واقع ہوا ہے۔ یہ عزت اور فضیلت طلبی غرور کے درجے پر پہنچ کر مرد کو جانور سے بدتر کردیتی۔ مگر قدرت نے اس کا علاج عورت کی فطرت سے کیا ہے۔ اور جہاں قدرت نے عورت کو نرمی۔ حلم۔ صبر اور محبت کے صحیح مفہوم سے جو عین داد ہے مزین کیا ہے۔ وہاں اسکی صورت شکل۔ نقل و حرکت۔ مزاج اور برتاؤ میں ایک ایسی پاکیزہ لچک رکھدی ہے جس سے مغرور سا مغرور آدمی بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ مرد اور عورت میں مشترکہ جذبہ بقاء حیات انسانی کی خواہش اور آرام اور سکون حاصل کرنا ہے۔ مرد سمجھتا ہے کہ یہ بقا اور سکون شجاعت لیاقت دولت وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے مگر عورت سمجھتی ہے کہ یہ اہم کام زندگی کی کرخت باتوں میں نرمی پیدا کرنے

اور زینت کا طمع دینے سے پورا ہوتا ہے۔

غیر مشترک صفات مرد اور عورت کے یہ ہیں مرد اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے بہت جلد جبر اور بے اعتدالی کو کام میں لانے لگتا ہے جسکا راز یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے مقاصد کی کامیابی کے لیے قربان کرنے کی نیت رکھتا ہے۔ اسکے برعکس عورت ہر وقت قربان ہونے کے لیے تیار رہتی ہے

اب مرد اور عورت کو جمع کرنے سے منشا رقدرت یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک کی عزت طلبی دوسرے کی محبت رسی ایک کی سرفرازی دوسرے کی شاعرانہ رنگینی۔ ایک کی دنیا بھر کو اپنے لیے قربان کرنے کی خواہش دوسرے کی ہر یگانہ اور بیگانہ کے لیے قربان ہو جانے کی نیت۔ غرض یہ سب چیزیں مل کر زندگی کے غبارہ کو اعتدال اور لطافت کے ساتھ پرواز میں لائیں اور خواہشات جسمانی اور نفسانی کی زنجیروں کو محبت کے غیر محسوس مگر پُر اثر ضرب سے توڑ کر حیات حقیقی اور کیفیت روحانی سے مشرف ہوں۔ سبحان اللہ

ع یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جاے ہے

(۲)

یہ دریافت کرنے کے بعد مرد اور عورت کا یکجا ہونا بہترین منشا و قدرت ہے مذہب اور رواج نے ابتدا سے سینکڑوں پلٹے کھاے مگر آخر یہ لڑھکتی ہوی گیند یہیں آکر ٹھہری کہ شادی بیاہ اور محبت کے بیش قیمت تخت پر ان کو جلوہ افروز کرنا چاہیے۔ بعض ملکوں میں شادی سے پہلے محبت کا ہو جانا لازمی قرار دیا گیا بعض ملکوں میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم اسطور کی دی گئی کہ بعد شادی کے محبت کا ہونا شاذ و نادر ٹھہرا۔ بہرحال محبت دونوں اسکیموں میں جزء مشترک رہی محبت بعض حالتوں میں اتفاقی اور پہلی مرتبہ دوچار ہونے کا نتیجہ بھی سہی مگر بھر بھی

مزاج شناسی اور عام رواداری کے بہت سے مدارج ایسے ہیں جنکو نیک نیتی اور احتیاط کے ساتھ طے کرنے سے مرد اور عورت دونوں کا بام محبت پر پہنچنا ناممکن نہیں۔ اسوقت ہم صرف اسی شق پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ مرد ہوں یا عورتیں بعضے بالطبع خاموش۔ سنجیدہ اور جذبات کو پوشیدہ رکھنے والے ہیں۔ برعکس انکے بعض زیادہ بولنا چالنا۔ جنسی مذاق اور جذبات کا اظہار کچھ بُرا نہیں سمجھتے۔ جہانتک صداقت اور راستبازی شامل ہو وہاں تک ان دونوں باتوں میں کوئی عیب نہیں مگر ان ہی متضاد صفات میں سے اگر خاوند ایک صفت کا ہوا اور بیوی دوسری صفت کی تو باوجود حقیقی محبت کی پوشیدہ چنگاری کے دونوں میں دن رات کے برتاؤ میں بہت کچھ اختلاف بلکہ بعض اوقات مخالفت پائی جائے گی اور کوئی بھی اُنکو سچی محبت اور رواداری کے بہترین نمونے نہ تسلیم کرے گا۔ مگر یہی دونوں اگر ایک دوسرے کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ لیں اور دن رات کے برتاؤ میں میانہ روی اختیار کریں تو گو شروع شروع میں جوشیلی طبیعت والوں کے لیے گونہ باعثِ افسردگی اور پژمردہ دلی ہوگا مگر آگے چل کر ان ہی دونوں میں ایسا سمویا ہوا زریں رشتہ سچی محبت کا قائم ہو جائے گا جو نہ صرف اُن کی متحد زندگی کو کامیاب اور شاداب کرے گا بلکہ جو اوروں کے لیے بھی قابل تقلید ثابت ہوگا۔

جن نوجوانوں نے مغربی تعلیم حاصل کی ہے اُنکو اس معاملہ میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ مغرب میں مرد اور عورت دونوں دل کی حقیقی رہنمائی سے یکساں طور پر محبت کا اظہار بکمالِ صداقت و شرافت سمجھتے ہیں ایشیائی عورتیں مرد کی طرف سے سچی محبت کا اظہار ہونے پر اُسی رفتار بلکہ اُس سے بھی تیز رفتاری کے ساتھ استقبالِ محبت کے لیے تیار ہوتی ہیں اور جان

قربان کردیتی ہیں مگر یکساں الفاظ یا یکساں حرکات و سکنات سے یکساں طور پر اظہار محبت سے قاصر رہتی ہیں۔ اسے کسی حال ہیں فقدان محبت پر محمول نہ کرنا چاہیے۔ اولاد ہونے کے بعد عورت کا دل فطرتاً بچوں میں زیادہ لگ جاتا ہے اور خاوند کے ساتھ ہر وقت اُٹھنے بیٹھنے میں کمی ہونے لگتی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُسے خاوند سے محبت کم ہو گئی ہے۔ مرد کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اولاد ہونے کے بعد عورت دنیا کے مقدس تریں کام میں مصروف ہے اور لازم تو یہ ہے کہ مرد اُس کا پورا ہاتھ بٹائے مگر یہ نہ ہو سکے تو اُس سے محبت میں کمی کرنے کی شکایت تو نہ کرے۔

جس طرح زن وشو کی محبت فطری اور مقدس ہے اُسی طرح اولاد کی محبت بھی قدرتی اور پاک ہے۔ دونوں محبتیں ایک دوسرے کے منافی نہیں۔ دونوں ایک ساتھ چلنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ محبت خواہ کتنی ہی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو ہر جزوی حالت اور عادت کا تجسس یا اظہار اور ہر بات میں انتہا درجہ کی بے تکلفی کچھ بہت مفید ثابت نہیں ہوتی۔ خصوصاً عورت کے لیے اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ عورت اپنا دل الگ رکھے یا خواہ مخواہ گھنی رہے مگر اُسے چاہیے کہ وہ کسی حال میں اپنے آپ کو نہ بھولے اور نفاست اور خوش دلی کے ساتھ خوشگوار رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھے۔ جس سے اُسکی قدر و منزلت میں فرق نہ آئے۔ کیونکہ اسی قدر و منزلت پر گھر کے قیام اور بچوں کی تربیت کا انحصار ہے۔ سچی محبت میں پوری قدر و منزلت خود مضمر ہوتی ہے مگر بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں میں یہ قدر و منزلت جھوجھری ہوتے ہوتے محبت کے مستحکم اور مضبوط قلعہ کو بھی بوسیدہ کر دیتی ہے۔ اور زندہ در گور ہیں وہ خاوند اور بیوی جنہیں باہمی محبت اور قدر و منزلت نہ رہے۔

(باقی آئندہ)

سرفراز حسین

اُردو شاعری

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

استاد الشعرا میرؔ مرحوم نے شعر بالا بظاہر اپنی حالت پر لکھا ہے یا اسمیں عموماً عاشقوں کی رسوائی و بے توقیری کا نقشہ کھینچ کر دکھلایا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عاشقی کبھی اسقدر عزت سادات یا مشائخ کو خاک میں ملانے والی نہیں ثابت ہوئی جسقدر شاعری قولاً و فعلاً شیخ، سید، مغل، پٹھان، چھتری، راجپوت کو فرداً فرداً نہیں بلکہ من حیث القوم بھی بدنام و رسوا کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اور اردو شاعری کے تمام زمانے پر نظر کرنے کے بعد اس تمام لٹریچر کا اکثر حصہ ایسا نکلے گا جس کو پڑھکر ہمیں بے اختیار یہ کہنا پڑے گا

اس شاعری میں عزت اقوام بھی گئی۔

جب ہم یہ غور کرتے ہیں کہ شاعر سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ وہ اپنے زمانہ، ملک و قوم کے جذبات و محسوسات کو ظاہر کرتا ہے اور جب ہم ہر شاعر کے سوانح پر نظر ڈال کر یہ تحقیق کرتے ہیں کہ اس نے اپنے کلام میں اپنی مصیبتوں کا مرثیہ یا کامرانیوں کا زمزمہ نہیں گایا ہے تو ہم اس کلیہ کو جو تحریک شعر گوئی کی بنا ہے، شعر ذیل میں تسلیم کرتے ہیں ؎

طبع شاعر کو بنا دیتا ہے مجزوں ذکر درد
داغ کھا کر ہر کسی کے رازداں ہم ہو گئے

اور یہ سوچنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ اُردو شاعری کی کیا کیا خصوصیتیں ہیں

اور ان خصوصیتوں کے محرک و مؤید کون کون اسباب ہیں۔
عموماً تسلیم کیا گیا ہے کہ شمس اللہ ولی اُردو شاعری کی داغ بیل ڈالنے والے ہیں اور ان ہی کی باغبانی کا نتیجہ ہماری شاعری کے پھول پھل ہیں۔ گویا اُردو شاعری نے محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں جنم لیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ مغلئی خصوصیات مٹ چکی تھیں یا مٹنے ہی کو تھیں۔ ایرانی تمدن اور ہندی معاشرت ہو چل آریہ معاشرت نہ تھی بلکہ ایک مفتوح قوم کی مخلوط اور اختلاط پذیر معاشرت رہ گئی تھی" شاہی مزاج کا خمیر بن چکی تھی۔ اور یہ اثر فرق حکومت سے اعضائے رئیسہ اتوی رگ و ریشہ میں سے سرایت کرتا ہوا ملک کے طبقے تک پہنچ گیا تھا۔ پس اُردو شاعری اس زبان کی شاعری بنی جو ہماکے الفاظ، فارسی کی صرف و نحو اور ترکی، عربی، ہندی، فارسی محاوروں، اصطلاحوں اور طرز ادا سے مرکب تھی۔ اُردو زبان کو شاہی سکہ تو بہادر شاہ ظفر کے بیس تیس سال قبل ہی ملا، جبکہ اُردو محاوروں، استعاروں اور مثالوں کی سند بیگمات سے لی جانے لگی۔ اور علمی درجہ اسکو شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی کے طفیل حاصل ہوا، جنھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ ورنہ اس سے پہلے علماء اُردو میں کسی قسم کی تحریر کرنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت ولی دکن سے دہلی میں اپنا دیوان لے کر آئے ہیں تو ان کے کلام کو تحسین و استعجاب سے سُنا اور پسند کیا گیا ولی کے کلام سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ وہ فارسی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اسکے معنے یہ نہیں کہ ان کے طرز بیان میں فارسیت یا غالبیت تھی بلکہ یہ کہ اُنکے کلام میں جذبات کا اظہار فارسی شعرا کے اسلوب پر کیا گیا تھا۔ اس بارے میں ہم اُن کو الزام نہیں دے سکتے

اُردو شاعری

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

استاد الشعرا میرؔ مرحوم نے شعر بالا بظاہر اپنی حالت پر لکھا ہے یا اسمیں عموماً عاشقوں کی رسوائی و بے توقیری کا نقشہ کھینچ کر دکھلایا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عاشقی کبھی اسقدر عزت سادات یا مشائخ کو خاک میں ملانے والی نہیں ثابت ہوئی جسقدر شاعری قولاً و فعلاً شیخ، سید، مغل، پٹھان، چھتری راجپوت کو فرداً فرداً نہیں بلکہ من حیث القوم بھی بدنام و رسوا کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اور اردو شاعری کے تمام زمانے پر نظر کرنے کے بعد اس تمام لٹریچر کا اکثر حصہ ایسا نکلے گا جس کو پڑھکر ہمیں بے اختیار یہ کہنا پڑے گا

اس شاعری میں عزت اقوام بھی گئی۔

جب ہم یہ غور کرتے ہیں کہ شاعر سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ وہ اپنے زمانہ ملک و قوم کے جذبات و محسوسات کو ظاہر کرتا ہے اور جب ہم ہر شاعر کے سوانح پر نظر ڈال کر یہ تحقیق کرتے ہیں کہ اس نے اپنے کلام میں اپنی مصیبتوں کا مرثیہ یا کامرانیوں کا زمزمہ نہیں گایا ہے تو ہم اس کلیہ کو جو تحریک شعر گوئی کی بنا ہے، شعر ذیل میں تسلیم کرتے ہیں ؎

طبع شاعر کو بنا دیتا ہے مجذوب ذکر درد
داغ کھا کر ہر کسی کے رازداں ہم ہوگئے

اور یہ سوچنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں کہ اردو شاعری کی کیا کیا خصوصیتیں ہیں

اور ان خصوصیتوں کے محرک و مؤید کون کون اسباب ہیں۔

عموماً تسلیم کیا گیا ہے کہ شمس اللہ ولی اُردو شاعری کی داغ بیل ڈالنے والے ہیں اور ان ہی کی باغبانی کا نتیجہ ہماری شاعری کے پھول پھل ہیں گویا اُردو شاعری نے محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں جنم لیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ مغلی خصوصیات مٹ چکی تھیں یا مٹنے ہی کو تھیں۔ ایرانی تمدن اور ہندی معاشرت جو اصل آریہ معاشرت نہ تھی بلکہ ایک مفتوح قوم کی مخلوط اور اختلاط پذیر معاشرت رہ گئی تھی" شاہی مزاج کا خمیر بن چکی تھی۔ اور یہ اثر فرق حکومت سے اعضائے رئیسہ توی ارگ وریشہ میں سے سرایت کرتا ہوا ملک کے طبقے تک پہنچ گیا تھا۔ پس اردو شاعری اس زبان کی شاعری بنی جو بھاشا کے الفاظ، فارسی کی صرف و نحو اور ترکی، عربی، ہندی، فارسی محاوروں، اصطلاحوں اور طرز ادا سے مرکب تھی۔ اُردو زبان کو شاہی سکہ تو بہادر شاہ ظفر کے بیس تیس سال قبل ہی ملا، جبکہ اُردو محاوروں، استعاروں اور مثالوں کی سند بیگمات سے لی جانے لگی۔ اور علمی درجہ اسکو شاہ عبدالقادر صاحبؒ دہلوی کے طفیل حاصل ہوا، جنھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ ورنہ اس سے پہلے علماء اُردو میں کسی قسم کی تحریر کرنا کسر شان سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت ولی دکن سے دہلی میں اپنا دیوان لے کر آئے ہیں، تو ان کے کلام کو تحسین و استعجاب سے سنا اور پسند کیا گیا۔ ولی کے کلام سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ وہ فارسی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اسکے معنے یہ نہیں کہ ان کے طرز بیان میں فارسیت یا غالبیت تھی بلکہ یہ کہ اُنکے کلام میں جذبات کا اظہار فارسی شعراء کے اسلوب پر کیا گیا تھا۔ اس بارے میں ہم اُن کو الزام نہیں دیسکتے

کہ انھوں نے غیر ملک کی زبان میں حسن وعشق کا چرچا کیا۔ وہ مجبور تھے ؎

نالہ پابند نے نہیں ہے
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

آریہ ورت کی اصلی شان وشوکت کا نظارہ ان کی آنکھوں نے دیکھا نہ تھا بھاوَ بھوتی، ویاسی، والمیک اور کالیداس کا معجز نما اور رنگا رنگ کلام انکے کانوں نے سُنا نہ تھا۔ خود وہ شیریں اور ام الالسنہ زبان جس کے بولنے والوں کی نسلیں آج دنیا کے مختلف اقطاع میں پھیلی ہوی ہیں، زبان کی حیثیت سے ناپید ہو چکی تھی۔ پس سنسکرت کی شاعری سے کسی مقبول ومعقول درجہ تک استفادہ کرنا دائرہ امکان سے بعید تھا۔ شاعری کے میدان میں جو تخیلات ملک کے ہر طبقے پر حاوی تھے وہ خاقانی، فردوسی، انوری، سعدی، حافظ، جامی، قاآنی، عرفی، فیضی، حزیں وغیرہم شعرا اساتذہ کے تخیلات وتصرفات تھے۔ ان زبردست وقادر الکلام شعرا کے ساتھ سمرقند، ترکستان، ایران کے مناظر چمن، کہسار، ندی نالے بھی اہل ہندوستان کے جذبات کے درد مند غمگسار ہو گئے۔ بعینہ جیسا کہ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ یورپین طرز معاشرت، طریق بود وماند اکل وشرب، لباس ووضع، گفتگو وطرز خیال ہماری زندگیوں کا لازمہ بن گئی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کوہ ہمالہ دنیا کا عظیم ترین پہاڑ ہے، مگر ہم تعریف کوہ البائن کی ہی کریں گے کیونکہ ایسا کرنا اگر اس تاریخی پہاڑ کو دیکھ لینے کی دلیل نہیں ہے تو کم از کم اس سوسائیٹی میں ملنے جلنے اور اس لٹریچر سے آشنا ہونے کی دلیل ضرور ہے جس میں اسکی مدح سرائی کی گئی ہے۔ اگر بچشم حقیقت سے دیکھا جائے تو ہندوستان کے اصل باشندوں کو یا ان باشندوں کو جو اسکے متوطن ہوتے رہے، کبھی یہ دیکھ بھال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ گھر میں کیا کچھ موجود ہے!

بیل گونڈا ابھی اس درجۂ ارتقا میں نہ پہنچے تھے کہ ہمالیہ کی برفانی چوٹیاں، اسکی مختلف شاداب وگلستاں خیز گھاٹیاں اور پہاڑیاں، گنگا جمنا اور نربدا کے متموج دروانیساں اور اودھ، گجرات اور پنجاب کی سرسبز وزرخیز زمینیں ان میں نظم کے ولولے پیدا کریں اور کالیداس ووالمیک کے قابل تقلید پیشرو ان میں جنم لیتے۔ سنسکرت اور اسکی نظم ابھی زبان زد عام نہ ہوئی تھی۔ اس میں زیادہ تر قصور اس گروہ کا ہے جو دنیا کو مذہباً محدود کر چکے تھے) کہ مسلمانوں کے ہیرے پھیرے ہونے لگے اور آہستہ آہستہ وہ یورشوں سے فتوحات کی شکل میں آنے لگے۔ بارھویں صدی کے آخر میں ان کے ڈیرے بھی یہیں نصب ہوگئے۔ اسکے بعد جو کچھ ہوا محتاج بیان نہیں ہے۔ اکبر نے ہندو و مسلم کو ایک قالب میں ڈھالنے کی کوشش شروع کی، اسیوقت یورپین اقوام کی تاجرانہ سیاحت اس مخلوط تہذیب میں تیسرا جزو بن کر شامل ہونے لگی۔ اور اس جزو کو جو تاثیر آج حاصل ہے، وہ سب کو معلوم ہے

بیان بالا سے جو شاید کسی قدر طول پکڑ گیا ہے، یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو شاعری کسی مربوط، مستقل، مسلسل اور خانہ ساز تمدن میں نشوونما نہیں ہوئی۔ بلکہ ہمیشہ غیر ملکی آب و ہوا میں پیدا ہوئی، پلی اور بڑھی یہی وجہ ہے کہ مالاتی اور مادھو اور پریا درسکا کے حسن و عشق کے چرچے لیلی مجنوں شیریں وفرہاد اور مانی و بہزاد کے آگے ماند ہوگئے۔ یہی سبب ہے کہ رستم و سہراب و افراسیاب جو محض نامور جنرل تھے، راجگان مہابھارت اور راماین کے اوتاروں سے زیادہ اُردو لٹریچر کا جزو بن گئے۔ فیضی نے نل دمن کو فارسی میں لکھا اور زندۂ جاوید کرنے کی کوشش کی، مگر جس اسلوب اردو شعرا نے قلم اُٹھائے تھے وہ ان طالب ومطلوب کو شاعری کے سوزوساز

ہیں ہٹلا نہ سکا۔ اگر سنسکرت شاعری یا بھاشا کی نظم اسی تخیل، بلند پروازی اور شیرینی کے ساتھ قائم رہتی جو سولھویں اور سترھویں صدی تک جے دیو اور مادھو کے دم سے پرانی جھلک دکھلا رہی تھی اور اگر سنسکرت اپنی بیٹیوں بنگالی دیوناگری اور خود اردو کے ساتھ عصا ٹیکے ہوئے بھی زندہ رہتی تو بھی ناممکن تھا کہ سیتا، دروپدی، شکنتلا اور کنتلا کے کارنامے اور مہابھارت رامائن، گھمدوتا اور گیتا گووندا کے نازک و فلک سیر خیالات اردو صنف نظم کو مالامال نہ کرتے۔ اس خیال کی تائید میں ہم امیر خسرو کی پہیلیاں اور دوہرے وغیرہ پیش کر سکتے ہیں نیز بعض کے تراجم کی مثالیں دے سکتے ہیں یعنی جب تک خود زبان کے انشا پردازوں میں جان رہی ان کا اثر دیگر زبانوں کے ناظموں پر ہوتا رہا۔ اس کے جواب میں ... ہندی شاعری جو درد و سوز میں ڈوبی ہوئی ہے اب بھی زندہ ہے لیکن اسکی زندگی ایسی ہی ہے جیسا کہ اٹلی میں قدیم ... لاطینی زبان۔ علاوہ ازیں جسوقت اردو علمی زبان کی شکل میں ... اس وقت باقی سب زبانوں مثل بنگلہ، ناگری، تامل، پنجابی ... زبانوں کو دربار شاہی میں دخل پانے کا برابر موقع تھا بلکہ ... ایک وقت ایسا گذرا ہے کہ اردو زبان کا ہیولہ بھی موجود نہ تھا اور حکمرانوں کو بھاشا اور دیگر ہم مخرج زبانوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے میں کوئی تعصب یا سیاسی مصلحت درپیش نہ تھی۔ لیکن دہلی و آگرہ کے اثر نے غلبہ کیا اور جوں جوں فاتح قوم کے افراد اپنے جدید ہم وطنوں کے ساتھ شیر و شکر ہوتے گئے، فارسی اور بھاشا سہیلیاں بنتی گئیں۔ زمانہ ... ضروری تھا کہ کتابت فارسی نستعلیق کی شکل پر مجبور ...

مقابلہ تھا۔ اسوقت عوام کی زبان بھاشا نے جس کا کچھ نمونہ اتنک کا مثنی [illegible]
اور بانگرے کے علاقوں میں مل سکتاہے جو کچھ پیش کیا [illegible]
فارس کے ہزار ہا سال کے منجھے ہوئے شگفتہ تخیل سے انکا [illegible]
[illegible] شعرا بھونرے کو چھوڑ کر بلبلیں پکڑنے لگے اور سورج مکھی کی جگہ گل شبو
سونگھنے لگے۔ یہ کہنے سے میرا منشا ہرگز یہ نہیں کہ بلبل وگل میں شعریت نہیں ہے اور
[illegible] وجہ کماں نہیں صرف یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ ہم نے غیروں کے حسن وعشق کو
اپنے دل کے حسن وعشق پر کیوں اور کس طرح ترجیح دی
[illegible] نے وہ اسباب بیان کئے ہیں جو اُردو زبان کو وجود میں لائے
[illegible] جن کی وجہ سے اُردو شاعری منفعل اور اثر پذیر ہوئی [illegible]
[illegible] کا جو ہماری شاعری کی موجودہ شکل وضع [illegible]
[illegible] ہوئے ہیں۔
[illegible] شاعری میں سب سے زیادہ قابل اعتراض شے وہ معشوق [illegible]
[illegible] میں نظر نہیں آسکتا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ کسی
[illegible] قلمی خاکہ اس معشوق کا کھینچ کر دکھلایا تھا، مجھے
[illegible] اگر [illegible] شاعر [illegible] اس خاکہ کو دیکھ لیا ہوگا تو پھر اپنے واقعی معشوق
[illegible] تعریف میں [illegible] کوئی شعر نہ کہا ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں
[illegible] کو جانوروں، پودوں، اور پتھروں کا مثل یا مشبہ بہ بنایا جائے۔ حالانکہ
[illegible] جانتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہرن
[illegible] دیکھکر معشوق کی آنکھ کا یاد آنا بروے منطق جائز اور قدرتی ہے
[illegible] تو آنا چاہیے کہ [illegible] آنکھ [illegible] [illegible] ہو دیکھکر
[illegible] ہے اور [illegible] معشوق

بے اعتنائی و ناز آفرینی سے ہے۔ ہم اپنے دلربا کو سرو قد کہتے ہیں، کیوں؟ کیا بزد بان کے استعمال کے لیے قد محبوب ہی مناسب ہے! اور جب اسکے ساتھ یہ خیال بھی ملا یا جائے کہ آپ سیڑھی لگا کر بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتے اور آپ کے رقیبوں کا گروہ مور و ملخ کی مانند چوٹی تک کی خبر لاتا ہے تو آپ کی بد مذاقی و بے غیرتی کا اس سے بدتر ثبوت نہیں مل سکتا۔ اسکے معنی یا تو یہ ہیں کہ آپ کی عاشقی محض شعر گوئی تک محدود ہے، آپ شعروں میں اپنا مرثیہ کہتے ہیں اور آپ کے رقیب آپ کا عملی مذاق اڑاتے ہیں یا اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا "معشوق" واقعی کوئی سرو ہے، جسکے سر پر انسان کی کھوپڑی لگائی ہوئی ہے، اسپر بال کچھ تو انسان کے ہیں اور جہاں سے زلفیں اور کاکل شروع ہوتے ہیں وہاں سنبل اور سانپ لٹکا دیے گئے ہیں۔ گردن کی جگہ کسی صراحی کا گلا توڑ کر چپکا دیا گیا ہے۔ آنکھیں ہرن کی نکال کر بٹھادی گئی ہیں، دل کی جگہ ایک پتھر باندھ دیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ الغرض یہ ایسا بےحس و باحس چھلاوا ہے جس کی نظیر انسان، جن، حیوان، نباتات، موجودات میں باتمامہ مل نہیں سکتی۔ ہربات فرضی و ذہنی ہے۔ مگر اسکے نتائج کیا ہوے۔ شاعری بجاے سچے جذباتِ محبت پیدا کرنے کے تخریب اخلاق کا پیش خیمہ ہوگئی۔ اچھے اچھے نیک کردار شاعروں کو بھی زورِ طبیعت اور قادر الکلامی دکھانے کے لیے واسوخت جیسی نظمیں تصنیف کرنی پڑیں۔ کیا کوئی صاحب غیرت شخص ایسے بازاری خیالات کو نثر میں آپ بیتی کے طور پر بیان کرنا بھی پسند کرے گا! لیکن تخیل کی رو میں آکر ہم اپنے چال چلن کے ساتھ ایسی ایسی رکیک باتوں کو منسوب کرلیتے ہیں جو کوئی شریف آدمی اپنی اولاد اور بہو بیٹیوں کے لیے کبھی گوارا نہیں کرسکتا۔ لیکن اسیر بھی واہ وا ہوتی ہے اور بھولا شاعر بقول اسیر

ع سو بوتلوں کا نشہ ہے اس واہ واہ میں

ترنگ سے لے کر اور فرضی باتیں منظوم کرتا ہے ۔ اسی ملکی حالت پر جل کر غالب مرحوم کی پاکیزہ طبیعت نے شعر ذیل کہا ہوگا :

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروے شیوۂ اہل نظر گئی

ہمارے معشوق پر ایک اور اعتراض ہے اور وہ بہت ہی شرمناک اعتراض ہے یعنی وہ صیغۂ تذکیر سے تعلق رکھتا ہے اسکی اصلی وجہ تو فارسی تتبع ہے ۔ متقدمین فارسی نے علانیہ یا نہاں جس طرح بھی اس معشوق کو اپنا ہم جنس بنایا اس کی وجہ ان کی تصوف مزاجی تھی ۔ صنف لطیف کا خیال و شوق (شاعرانہ شوق کو درجۂ استغراق حاصل ہوتا ہے) میں نفسانیت کا حملہ آور ہو جانا قرین قیاس و باعث رسوائی بھی تھا ۔ اسیلیے انھوں نے ناکردہ گناہ ماخوذ ہونے اور تشیع افعاحشہ کے الزام سے بچنے کی خاطر اس اسلوب کو اختیار کیا ، وہ اپنی پاکیزہ طبائع کے اقتضا سے ابناے جنس کو ہی صحیح الفطرت سمجھتے تھے ، مگر انھیں قوم لوطؑ کا بھی خیال آنا چاہیے تھا ۔ وہ جیسا کہ شیخ عراقیؒ کے مشہور مطلع سے

صنما رہ قلندر سزدار بہ من نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس مجاز کو حقیقت کی نردباں بناتے تھے مگر تہمت لگانے والی گندی طبیعتوں نے ان پر بھی بہتان لگایا ۔ بہر نوع اس کے سوا اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ۔ دنیا میں سواے فارسی و اردو شاعری کے کہیں معشوق کو مذکر نہیں باندھا گیا ۔ لیکن اب اسقدر افراط ہو گئی ہے کہ

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

کی حقیقت بھی مشتبہ ہوگئی۔ میری رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس صنف کو
کھلم کھلا درجۂ محبوبیت عطا کر دیں جسے قدرت نے اس کا اہل و مستحق بنایا
ہے۔ ہندی شاعری میں عورت عاشق کا درجہ لیے ہوئے ہے، اس میں ورد
ہونے کی یہی وجہ ہے

ہمارے ہاں بھی ریختی ایجاد ہوئی مگر وہ رکیک ہوگئی۔ ہندی میں نیا ڈگر
گھر بار زندگی کو عشق و محبت کا رنگ دیا جاتا ہے۔ اسلیے اس میں حیوانیت
پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اردو شاعری میں اسقدر تبدیلی نبھ
نہ سکے گی۔ ہمیں حسن و عشق کو قدرتی رنگ میں دیکھنا چاہیے۔ اپنی اپنی
جگہ ذکور و اناث دونوں میں حسن صورت موجود ہے، دونوں کے دلوں میں
درد ہے احساس ہے۔ پس دونوں کا عاشق ہونا یا معشوق بننا عین اقتضائے
فطرت ہے۔

اسی ذیل میں ایک اور اعتراض ہے، جو بالکل طبیعت انسانی کے منافی
و متضاد ہے۔ وہ معشوق کی کور باطنی، سنگدلی، بے رحمی، بے رخی، آشنا بیگانگی،
بیگانہ دوستی یا سراسر بے معنی، شوخی لالعینی کا ذکر ہے، وہ زندہ عاشق کو اپنے ہاتھوں
سے تڑپا تڑپا کر قتل و بے جان کرنے میں مزے لیتا ہے اور جب وہ مر جاتا ہے
تو کوئی معشوق روتا اور افسوس کرتا ہے اور جو معشوق کامل ہے یعنی درجۂ
انسانیت سے بالکل گرا ہوا ہوتا ہے، وہ رقیبوں کے ساتھ جشن کرتا اور ٹھوکریں
مارتے، اس کی قبر تک کو ہموار کر دیتا ہے۔ حالانکہ صحیح جذبہ جو داستان پردازی
کے اعلیٰ ترین و شیریں ترین صنف کو پیدا کرنا چاہیے تھا، وہ یہ تھا کہ عشق

صادق اور محبت پاک تھی تو معشوق پر اثر ہوا اور وہ خود سوز عشق میں مبتلا ہو گیا اور اگر عشق فاسد تھا تو معشوق کی پاکیزہ طبیعت کو روز بروز نفرت بڑھتی گئی۔ اور اس نے اس بوالہوسی پر مطلق التفات نہ کیا۔ اگر جذبات کا اظہار اس طرح کیا جائے تو ہمارے شعر نیچرل ہوں گے اور جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے اس کا سچا نقشہ ہوں گے اور ملک کے مذاق کو صحیح راستہ پر لے جائیں گے۔ ایسے کلام سے مجاز و حقیقت میں بھی قرب ہو جائے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے تمام شعرا کا تمام کلام مبتذل ہے، نہیں اساتذہ کے کلام کیفیت، معنی آفرینی، تنوع اور اظہار فطرت سے خالی نہیں۔ مگر غالب حصہ جسے دیکھ دیکھکر ہر نو اندوختہ شاعر بننے کی بات کرتا ہے۔ وہ قطعی بزم رقص و سرود کے مطلب کا ہوتا ہے۔ اور اس سے اگر کوئی سبق سیکھ سکتے ہیں تو غافلان دنیا و آخرت ہی سیکھ سکتے ہیں۔

ایک اور عام و فاش غلطی جو شعرائے اردو کرتے ہیں وہ مذہب سے بے اعتنائی میں فخر کرنا ہے وہ لا مذہبی کا دعویٰ بھی نہیں کرتے لیکن مذہب یا پابندی مذہب کی تحقیر کو اپنا شرف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جو رمز اس خیال میں پوشیدہ رکھی گئی تھی اور ہے وہ غرض مند خدا پرستی کا بطلان تھا۔ یعنی خدا کی عبادت کی جائے تو نہ خوف جہنم سے اور نہ شوق حور و طہور سے قطعاً نہ درخصوصاً متصوفین نے "مذہب اور محبت" کو ایک کرنا چاہا تھا اور سب زہد خشک و ریاکاری کی مذمت توریت مقدس میں نام لے لیکر کی گئی ہے ہر ایک قوم کو سچا نا منظور تھا، یہ اصول تمام ادیان پر صادق آتا ہے اور خیال رندانہ مذہب کی بنا قرار دیا گیا ہے لیکن ہم نے اس میں اسقدر مبالغہ او بے شرمی سے کام لیا کہ ذاتی تحقیر و مذہبی تذلیل تک اتر آئے۔ اس ذیل میں

ہم نے اپنے فرضی مرتبۂ عرفان میں اسقدر رودن کی لی کہ انبیا علیہم السلام تک کی منزلت کو بھلا دیا حضرت موسیٰ حضرت یوسف، حضرت عیسےٰ ہماری بیہودہ بلند پروازیوں کے بہت شکار ہوتے ہیں۔ نعت گویوں نے (ان اساتذہ کو چھوڑکر جن کے کلام ایسے نوحش سے مبرا ہوتے ہیں) محمد رسول اللہ کی رفعت دکھانے کی کوشش میں دیگر انبیا سے ان کا ایسا مقابلہ شروع کر دیا جو مذہباً گناہ کبیرہ کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اس بارے میں جہاں تک مجھے اس وقت یاد ہے۔ ہمارے ہندو بھائیوں نے نسبتہً ادب سے کام لیا ہے۔ حضرت زلیخا کو شعرا نے غالباً کبھی ایک نبیِ جلیل القدر کی زوجہ سمجھا ہی نہیں۔ یہ سب فروگذاشتیں شاعرانہ تصرف کے بے جا اور نافہم استعمال کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ میرا یہ دعوی نہیں ہے کہ ہمارے فاضل شعرا اس امر سے آگاہ نہ تھے۔

اس جملہ بیان سے میرا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ اردو شاعری میں اصلاح کا مادہ ہی نہیں ہے یا وہ اسقدر پائے سے گر چکی ہے کہ اس کا ترک کر دینا لازم آتا ہے برخلاف ان اصحاب کے جو ہر وقت غیر زبانوں کی نظمیں اور گیت یاد کرتے اور گنگناتے رہتے ہیں اور اردو ادبیات کو سراسر ناقابل التفات سمجھتے ہیں، یہ ثابت کرنے کے لیے میں تیار ہوں، کہ ہمارے اساتذہ میں قریباً ہر اُستاد کے کلام میں ایسا نمونہ موجود ہے جو انکی طبیعت کے فطرتی رنگ کی جھلک دکھلا جاتا ہے اور جو صاف عیاں کرتا ہے کہ اگر ان سے اس رنگ کو اختیار کرنے کی توقع کی جاتی۔ تو ان کا تمام کلام قابل ناز سرمایۂ ادب ہوتا اب میرے خیال میں اُردو شاعری کو پاکیزہ روش پر لانے کی ترکیب اول تو خود شعرا کی توجہ سے وابستہ ہے۔ دوسرے فن تنقید کا

جاری کردینا اس کا صحیح علاج ہے آج تک (بجز ان جستہ جستہ کوششوں کے جو بعض اہل قلم نے رسالوں میں کی ہیں) ہمارے شعرا کے کلام پر تنقید نہیں لکھی گئی۔ مولانا نظم طباطبائی لکھنوی (حیدر آبادی) نے شرح غالب لکھ کر داغ بیل ڈالدی ہے۔ جو اصحاب مغربی فن تنقید سے براہ راست واقف ہیں وہ اسکو اور چلا دے سکتے ہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ذوق سلیم رکھنے والے سخن فہم اصحاب اردو شاعری کی اس خدمت پر کمربستہ ہو جائیں گے اور انجمن ترقی اردو اس ضمن میں اپنے وجود کے مفید ہونے کا عملی ثبوت دے گی۔ "بہر نوع" ؎

سخت کافر تھا جسنے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

عزیز منصور پوری

تبادلہ

چونکہ "تمدن" اب لکھنؤ سے شائع ہو رہا ہے اور اس کا موجودہ دفتر پل جھاؤ لال لکھنؤ ہے اس لیے تمام ایڈیٹران اخبار و رسالہ جات کی خدمت میں درخواست ہے کہ وہ تبادلہ میں اپنے پرچے ایڈیٹر "تمدن" پل جھاؤ لال کے پتہ پر روانہ کریں یہ پرچہ تو تمام اُن پرچوں کے دفتروں میں بھیجا گیا ہے جن کا نام ہمارے تبادلہ کی فہرست میں درج ہے اگلا پرچہ صرف ان پرچوں کے تبادلہ میں بھیجا جائیگا جو دفتر "تمدن" میں وصول ہونگے امید ہے کہ ایڈیٹران اسپر توجہ فرماکر تبادلے کے رجسٹروں میں پتہ تبدیل فرماکر مشکور فرمائیں ایڈیٹر

عالم خیال

آپ آ گئے تو ہوش ٹھکانے نہیں رہے
ہوش آ گیا تو آپ سرہانے نہیں رہے

ناظرین۔ خیالی عالم کی نیرنگیاں بھی اپنے دیکھنے والے کے سامنے نت نئے جلوے ہر دم پیش نظر کرتی رہتی ہیں۔ دل کی خواہشوں کے مطابق۔ خیالی تماشہ گاہ کی اسٹیج پر ہر وقت نئی نئی سینریاں (منظر) موجود ہیں اور چشم زدن میں ادھر ایک جھلکی ادھر غائب۔ غرض یہ تماشے اپنی دلفریبیوں میں ہر وقت دیکھنے والوں کو محور رکھتے ہیں۔

میرا جہاں تک خیال ہے۔ مجھے یقین ہوتا ہے کہ دنیا بھر میں ایک بھی ایسا آدمی نہ ہوگا جو عالم خیال کی دلچسپیوں میں دن رات اُلجھا نہ رہتا ہوگا۔

ہر شخص کئی دلفریب خیالات اپنے دل میں محفوظ رکھتا ہے اور جب اپنے کاروبار سے اسکو فرصت ملتی ہے ان میں محو ہو کر اُس کے مزے دل ہی دل میں لیا کرتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے دل کی قدرتی خاصیت شاید یہی ہے کہ ہر وقت کسی نہ کسی خیال میں محو رہے شاید کوئی وقت بھی ایسا نہ ہوتا ہوگا جو حضرت دل کسی سوچ بچار میں نہ رہتے ہوں بعض دلخوش کرنے والے خیالات کا اثر دیر تک معلوم ہوتا ہے۔ جس سے فلسفے والے کہتے ہیں کہ جسم کی نشو و نما بہت اچھی ہوتی ہے اور یہ صحت و تندرستی کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں اور اسی طرح بعض ملول کن خیالات بے حد نقصان پہنچانے سے باز نہیں رہتے۔ اسی لیے لوگوں کا

یہ کہنا سچ معلوم ہوتا ہے کہ خیالات کا اثر جسم انسانی پر بہت زبردست پڑتا ہے
خیالی دنیا کے رہنے والے قریب قریب ساری دنیا کے باشندے کہے
جا سکتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اُن میں شاید ایک بھی ایسا نہ ہو کہ جو دعوے
کے ساتھ کہہ سکے کہ میرا دل پانچ منٹ کے لیے بھی خیالات سے بالکل خالی رہا ہو
شاید اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ خلا محال ہے۔
بعض دل تو واقعی خیالات کے پتلے بنے ہوئے ہوتے ہوں گے کیونکہ منٹ
بھر کے اندر حضرت دل کی شاہراہ پر سیکڑوں خیالات کی سواریاں بڑی
بڑی شان و شوکت کے ساتھ گذر جاتی ہیں۔ ادھر ایک خیال ختم ہونے نہ پایا
تھا کہ دوسرا موجود تیسرا حاضر چوتھا پیش نظر اور اسی طرح یہ نہ ختم ہونے والا
سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یہانتک کہ عالم خواب میں بھی یہ خیالات پیچھا
نہیں چھوڑتے جو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر متفرق طور پر سامنے آتے رہتے ہیں۔
خیالات کو ایک مرکز پر قائم کرنے والے ہی اُس تنہائی کے مزے اچھی
طرح جانتے ہیں جو گوشۂ عافیت میں دین و دنیا سے بے خبر ہو کر کسی کے
تصور میں محو رہتے ہیں۔ ایک مشتاق دیدار آدھی رات کے وقت جبکہ
ہر طرف سناٹے کا عالم ہے دنیا کے نظارے پر ڈراپ سین پڑا ہوا ہے
عالم تصور میں کسی کی صورت کا نقشہ پیش نظر کیے ہوئے اس لطف کے
مزے لے رہا ہے جو اُس کے خیال میں اتنا بے بہا ہے کہ جس میں از حد محو
ہو کر اپنی ہستی تک کو بھول گیا۔ اور ایک بیخودی کے عالم میں کہہ رہا ہے

آپ آگئے تو ہوش ٹھکانے نہیں رہے

اور جس وقت یکایک کسی وجہ سے چونک پڑا تو وہ بیش قیمت نظارہ آنکھوں کے
سامنے سے غائب ہو گیا۔ اب پچھتا پچھتا کر کہہ رہا ہے۔

ہوش آگیا تو آپ سرہانے نہیں رہے۔ ایسی ہوشیاری سے بیہوشی اچھی

نیرنگ خیال کا سماں دنیوی رنگینیوں سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ صرف اتنا فرق ضرور ہے کہ عالم خیال میں ناکامی کا نحس وجود مفقود ہے۔

تصور میں مزے لیتا ہوں وصل یار کے ہردم
مجھے ملتا ہے وہ لکھا نہیں جو میری قسمت میں

اے شکستہ دلوں کی مومیائی۔ اے زخمی تنوں کے لیے مرہم زنگار تصور اگر دنیا میں لطف کا کچھ نشان پایا جاتا ہے تو وہ تجھ ہی میں ہے خیالی دنیا کے رہنے والوں سے یقیناً اس کے مزے پوشیدہ ہوں گے۔

ہمارے وصل سے نفرت سہی ارماں تو رہنے دو + مٹا دو گے اسے بھی کیا جو لکھا ہے مقدر میں

ارمانوں کے مزے۔ حسرتوں کے لطف۔ آرزوؤں کا ہجوم۔ تمناؤں کی دھوم اگر کسی کو دیکھنی ہو تو عالم تصور میں دیکھیے۔ کیسے کیسے لطیف نظارے پیش نظر ہوتے ہیں کہ جنہیں جدا ہونے کو اگر قابو چلے تو حشر تک جی نہ چاہے ایک مشتاق جمال فرماتے ہیں کہ اگر وصل سے نفرت ہے تو ارمان ہی رہنے دیجیئے ہم ارمانوں کی سیری بذریعہ تصور ہی کر لیا کریں گے۔

تصور ایک نہایت تیز دست مصور ہے جو حسب منشا ہر شے کا ہو بہو نقشہ چشم زدن میں تیار کرکے نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے جس میں کہیں اعتراض کرنے کی گنجایش نہیں ہوتی۔ اور بے دغدغہ جب تک جی چاہا اس نظارے کو دیکھے جائیے جس سے دلچسپی ہے۔ اور جس وقت طبیعت سیر ہوگئی ایک سکنڈ میں سارا کارخانہ درہم و برہم کر دیا۔ گویا کچھ تھا ہی نہیں یہ ایک ایسی دنیا ہے جو منٹ منٹ بھر میں بنتی بگڑتی رہتی ہے۔ حضرت دل اسکے بنانے کی مشین ہیں جب چاہتے ہیں بے مصالحہ کے بنا لیتے ہیں جیسے

مکڑی جالا تن لیتی ہے اور خود ہی اُسمیں پھنس جاتی ہے اسی طرح تمام آدمی اپنے اپنے خیالات کے سلسلے میں محو ہیں۔ اور اسی میں قید نظر آتے ہیں۔ اور جو غلطی ہوتی ہے۔ قید نہیں۔ اپنی ہستی کو قائم رکھتے ہیں۔ اگر خیالات کا وجود نہ رہے تو میرے خیال سے زندگی ممکن نہیں تو محال ضرور ہو جائے۔ اس لیے خیالات کا سلسلہ انسانی زندگی کا ایک لازمی اور ضروری حصہ اگر مان لیا جائے تو میری رائے میں شاید کچھ بیجا نہ ہو گا۔

م۔ ج۔ ا۔ دہلوی

سفرنامۂ قاری

والد ماجد قاری سرفراز حسین صاحب نے ہندوستان سے باہر اب تک دو سفر کیے ہیں۔ ایک دس برس ہوئے جاپان میں اور دوسرا پچھلے سال انگلستان میں۔ انکا ارادہ کوئی مستقل سفرنامہ لکھنے کا نہ تھا مگر انھوں نے کچھ نوٹ اپنے سفروں کے قلم بند کر لیے تھے۔ ان نوٹس میں اُن باتوں سے بہت کچھ گریز کیا گیا ہے جو عام طور پر سفرناموں میں درج ہوتی ہیں۔ مثلاً تاریخی اور جغرافیہ کی باتیں مگر وہ باتیں خاص طور پر قلمبند کی گئی ہیں جن سے نوجوانوں کو عمدہ اخلاقی سبق حاصل ہوں۔ اب اپنے متعدد احباب کے اصرار سے انھوں نے اپنا سفرنامہ ناظرین "تحمدن" کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے مرتب کرنا شروع کیا ہے۔ پہلی قسط جو بقول جناب والد ماجد کے بالکل خشک ہے اس پرچہ میں درج ہے۔ انشاء اللہ آیندہ اس سفرنامہ میں بہت دلچسپ اور مفید باتیں درج ہوں گی۔

ایڈیٹر

غروب آفتاب

آیندہ کے لیے تو ہم کو حضرات لکھنؤ سے بہت کچھ توقعات ہیں مگر اس دفعہ نثر میں اہل لکھنؤ کا بہت کم حصہ ہے مگر نظم کے حصہ میں حضرات لکھنؤ کا کلام قابل شکریہ ہے اور یہ ہمارے دیرینہ کرم فرما مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی کی عنایت کا نتیجہ ہے جنھوں نے نہ صرف خود ایک غزل اور ایک نظم مرحمت فرمائی بلکہ اپنے شہر کے دیگر مشہور شعرا سے غزلیں دلانے میں کوشش فرمائی اور لکھنؤ کے مشہور شعرا سے ہمارا تعارف کرایا۔ جناب ثاقب صاحب نے مستقل طور پہ ہمکو اپنا کلام مرحمت فرمانے اور اپنے احباب سے ان کا کلام دلانے کا وعدہ فرمایا ہے جس کے ہم تہِ دل سے ممنون ہیں بلکہ حضرت ثاقب نے اس قدر عنایت اور فراخ حوصلگی سے کام فرمایا ہے کہ دوسرے پرچہ کے لیے بھی غزل عنایت فرما دی ہے۔ امید ہے کہ جناب ثاقب صاحب کی طرح ہندوستان کے دیگر مشہور شعرا اور نثار صاحبان اپنا کلام ہم کو عنایت فرما کر شکریے کا موقع دیں گے اور یہ یقیناً ہمارے گلدستہ کے لیے موجب فخر و ناز ہوگا۔ حضرت ثاقب کی نظم حسب ذیل ہے:- (ایڈیٹر)

جانشین میرزا غالب حضرت ثاقب قزلباش لکھنوی

خدا کا نام لے اے طالبِ نور
کہ دن کی روشنی ہوتی ہے کافور

سرِ مشرق پہ آ پہنچا اندھیرا
عنانِ مہر کو گردوں نے پھیرا

غضب ڈھایا شبِ نو میہاں نے
اُفق کو آگ دیدی آسماں نے

رخِ مشرق پہ رنگ سوسنی ہے
درِ مغرب پہ کچھ کچھ روشنی ہے

شفق میں ہے یہ سورج کا قرینہ
کہ جیسے آگ میں نانِ شبینہ

کہاں تک دھوپ کی رنگت ہنوز زرد   ہوا جاتا ہے برج آتشیں سرد
تڑپ مدہم ہے روئے شعلہ زا کی   جلا جاتی رہی طشت طلا کی
شعاعوں نے جو آنکھیں پھیر لی ہیں   اندھیرے نے بھی راہیں گھیر لی ہیں
فروغ مہر تھا جن کے سہارے   وہ تار اب ہو گئے معدوم سارے
جو دیکھا یہ چراغ زیر دامن   پرندوں کو ملی راہ نشیمن
چلا ہے کوئی سوئے آشیانہ   بتھائے ہے کسی کو حرص دانا
اڑے جاتے ہیں سارے جانے والے   ارادے میں ہیں جلدی کھانے والے
اندھیرے کا جو بیچاروں کو ڈر ہے   کبھی دہنے کبھی بائیں نظر ہے
شمالی سمت کو جاتا ہے اک غول   کہ جس کی سبز پوشاکیں ہیں انمول
صدا پرواز کی آتی ہے ہر گام   بیاباں میں ہے سناٹا سر شام
ڈھونڈلکا ہو چلا ہے اب زمیں پر   کہیں ظلمت سوا ہے کم کہیں پر
توقف کا زمانہ ہے بہت کم   گلے ملتے ہیں دونوں وقت باہم
ہٹا کر طائروں کو زیر اشجار   سیہ بستر لگاتی ہے شب تار
سفر بھی ساتھ ہی دن کے ہے آخر   قریب آئے ہیں منزل کے مسافر
ہے دل کو رہروؤں کے فکر آرام   کہ آنکھیں ڈھونڈتی ہیں سرمۂ شام
کثافت سے طبیعت کو ہے الجھن   جھٹکتے ہیں غبار آلودہ دامن
کہیں مارے ہوئے منزل کے بیٹھے   وہ کیا بیٹھے سفینے دل کے بیٹھے
رگیں لیتی نہیں آرام اب تک   وہاں آئی نہیں ہے شام اب تک
وہ جنبش کر رہی ہیں اس طرح سے   کوئی دم توڑتا ہو جس طرح سے
بہم پہنچے نہیں راحت کے ساماں   تھکے ماندے مسافر ہیں پریشاں
کوئی تو آگ روشن کر رہا ہے   کوئی تدبیر مسکن کر رہا ہے

گئی ہمراہ مہر اس کی روانی
تھا بہتے ہوئے دریا کا پانی

کیا لہروں نے پیدا رنگ گیسو
سیہ ہونے لگا آئینہ جو

نظر آئی جو پانی میں سیاہی
تو جل اُٹھے چراغ فلس ماہی

نوید رحلت پروانہ لائیں
گھروں میں سے لیاں شمعوں کی آئیں

غزل ظرافت

حضرت ظریف لکھنوی کا کلام اپنی خاص نوعیت میں بہت ممتاز درجہ رکھتا ہے جو ناظرین کو غزلیات پڑھنے کے بعد معلوم ہو جائے گا انھوں نے دو غزلیں عنایت فرمائی ہیں جنمیں سے ایک غزلیات کی ذیل میں درج ہے اور ایک یہاں درج کی جاتی ہے — ایڈیٹر

جناب منشی سید مقبول حسین صاحب ظریف لکھنوی

حسب فرمائش جناب [illegible] قزلباش

تیرے کپڑوں کی لادی لادنا جب یاد کرتے ہیں
تو آخر شب کو دھوبی کے گدھے فریاد کرتے ہیں

کہو اُنسے جو اکثر شکوۂ بیداد کرتے ہیں
سبب اُنکے داد ہو جاتا ہے کیوں فریاد کرتے ہیں

بتوں کو بھول جاتے ہیں خدا کو یاد کرتے ہیں
برہمن جب سفر سوئے الہ آباد کرتے ہیں

نہ گردن مارتے ہیں یہ نہ دیتے ہیں کبھی پھانسی
حسینوں کو یہ سب مشہور کیوں جلاد کرتے ہیں

یہ مجنوں کوہکن تو جس زمین شعر کو دیکھو
وہاں بس چل گئے اک عاشق نیا آباد کرتے ہیں

ستم ایجاد کہتے ہیں یہ کیوں معشوق کو شاعر
ستم ہیں کیا کوئی کل ہے جسے ایجاد کرتے ہیں

ہمیں بتلا نہ دیں عاشق میں جو دوسرے کتابی کے
سبق ہے کیا کوئی معشوق جسکو یاد کرتے ہیں

سیہ مستوں کی شادی دختِ رز کے ساتھ ٹھہری ہے
مبارک حضرت پیر مغاں داماد کرتے ہیں

چڑیا مار انکو کہیے شوق سے کیا حرج ہے آئیں
شکار طائر دل بیٹھکے جو صیاد کرتے ہیں

یہ واٹر لیس کوئی ٹیلی گرام انہیں لگا ہے
کہ ہمکو ہچکیاں آتی ہیں صاحب یاد کرتے ہیں

حسینو کیا تمہارے باپ کے ہیں ہم غلام آخر
جو کہتے ہو ظریف اب ہم تمہیں آزاد کرتے ہیں

خدائی فوجدار

موجودات عالم میں یا یوں کہیے کہ اس ظاہری دنیا میں قدرت کے تمام کاموں کا ایک دلچسپ نقشہ انسانوں کی آنکھوں کے سامنے نظر آتا ہے کہیں ایک شخص عدالت کی کرسی پر رونق افروز ہے اور میزان عدل کے پلڑوں کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور انصاف کے لیے رتی سے رائی کا فرق نکال کر قدرت کے اس ضروری کام کو انجام دے رہا ہے جس کے بغیر کم از کم اس ظاہری دنیا میں ایک منٹ کو بھی کام نہیں چل سکتا۔ آگے چل کر دیکھیے تو ایک دوسرا شخص اپنے اوپر زیادتی کرنے والے کو محض اسلیے چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اسپر رحم کرنا چاہتا ہے۔ ایک تیسرا شخص جوان دونوں کے معاملہ کو دیکھ رہا ہو وہ ایک طرف تو رحم کرنے والے صاحب کی نیکی کی تعریف کرے گا مگر جب اسکو خدائی فوجداری کا خیال آئے گا تو اس کو محسوس ہو گا کہ اگر اس شخص کو بغیر سزا دیے چھوڑ دیا گیا تو یہ شخص آگے چل کر دوسرے شخص پر محض اس امید پر زیادتی کر سکتا ہے کہ وہ بھی مجھپر رحم کر دے گا۔ یہ خیال آتے ہی ہمارے خدائی فوجدار صاحب آگ ببولا ہو جاتے ہیں اور انصاف کے طالب ہو کر رحم کرنے والے سے لڑنے لگتے ہیں ''نیکی برباد گناہ لازم'' کی مثل صادق آتی ہے ہم یہاں سے اپنے خدائی فوجدار کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک شکرہ ایک درخت پر بیٹھا ہوا ایک چڑیا کو گھار رہا ہے۔ ہمارے خدائی فوجدار اس حرکت پر بہت طیش میں آئے اور اس شکرہ پر بندوق چلائی۔ تقدیر کا اچھا تھا

اتفاق سے شکرہ اُڑ گیا اور ہمارے خدائی فوجدار غصّہ میں بڑبڑاتے ہوے رہ گئے۔ ہمارے خدائی فوجدار دنیا کے اُن مشہور اور ہمدرد لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی زندگیاں دنیا میں ظلم اور زیادتی کے انسداد کے لیے وقف کردی ہیں اور اخیر میں یہ معلوم ہوا ہے کہ اسکا علاج کچھ نہیں۔

گوتم بُدھ نے اس ایک نکتہ پر قادر ہونے کے لیے جو کچھ ریاضتیں کیں وہ آج کسی سے چھُپی نہیں اور اصل تو یوں ہے کہ اسکی دنیا سے ظلم اور زیادتی کو مٹانے کی ہی کوشش نے اسکے اتنے پیرو کردیے اور اس کو بہت کچھ منوادیا۔ ہمارے خدائی فوجدار صاحب تو ان لوگوں میں سے ہیں جنکو دنیا اور دنیا والوں میں بیسیوں عیب معلوم ہوتے ہیں مگر اپنے میں عیب نظر نہیں آتا دوسرے کی آنکھ کا تنکا شہتیر دکھائی دیتا ہے اور اپنی آنکھ کا شہتیر تنکا بھی معلوم نہیں ہوتا۔ خدائی فوجدار سیر و شکار کے شوقین اور گوشت کھانے کے دلدادہ ہیں اگر آپ سے کوئی یہ پوچھے کہ جناب جب مرغیاں آپ کے لیے حلال ہیں تو آخر کیوں شکرے کے لیے چڑیا حرام ہونے کا فتوٰی آپ دیتے ہیں شکار میں جاکر آپ بیسیوں پرند اور چرند مار کر لاتے ہیں اور وہ آپ کے لیے کیونکر روا ہیں اور انکا گوشت آپ پر کیونکر حلال ہے۔ خدائی فوجدار صاحب یہی جواب دیں گے کہ قدرت نے یہ چیزیں ہمارے لیے وضع کی ہیں۔ خوب۔ اس اللہ کے بندے سے کوئی یہ تو پوچھے کہ۔ آپ نے قدرت پر کون سا احسان کیا ہے کہ جو قدرت نے آپ کو دنیا کی چیزوں کے جان و مال کے حقوق بخش دیے اور شکرے پر قدرت کا آپ نے کیونکر عتاب مان لیا کہ اس بچارے کو موجودات کا ایک چھوٹا سا پرند جانور کھانے کی اجازت نہیں۔ اس سے آگے چلیے تو اس

چڑیا نے قدرت کا کون جرم کیا ہے جو وہ شکرے کا شکار ہوئی اور وہ جانور جو آپ کی زبان کے ذائقہ کے لیے ذبح کیے۔ تڑپائے ہوئے بھلسے جاتے ہیں وہ کس جرم کی پاداش میں گردن زدنی کے قابل ہیں۔ خدائی فوجدار صاحب اگر اس سین کو دیکھ لیں جو ایک بلی چوہا پکڑ لینے کے بعد پیش کرتی ہے تو خدا جانے یہ آپے میں بھی رہیں یا نہیں۔ کہ بلی ایک جان کو سسکا سسکا کر لیا اپنے لیے باعث تفریح قرار دیتی ہے۔ مگر حضرت اگر بلی ظالم ہے تو آپ کون سے رحم دل ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ کسی جانور کو اپنی تفریح طبع کے لیے مار کر زہر مار کرنے کا اپنے تئیں حق دار سمجھتے ہیں اور اگر کوئی پوچھے تو بتا دیتے ہیں۔ مگر شکرے اور بلی کے زبان نہیں ہے وہ بھی چڑیا اور چوہے کو کھانے کا اپنے آپ کو حقدار سمجھتے ہیں مگر آپ کی طرح کج بحثی نہیں کر سکتے

جہاں دیکھو حضرت انسان درندوں کا ذکر "موذی" جانور کہہ کر کرتے ہیں کوئی پوچھے کہ وہ موذی کیوں ہوئے؟ کیونکہ وہ انسان کو کھا جاتے ہیں کیا خوب۔ کیا نرالی منطق ہے۔ آپ کو جو کھائے وہ موذی اور آپ اگر کسی کو کھائیں تو آپ کو کوئی خطاب بھی نہیں دیا جائے بلکہ آپ نہایت سادہ لوحی سے کہہ دیں کہ یہ چیزیں ہمارے لیے بنائی گئی ہیں۔ اگر آپ کو انسان اسی لیے بنایا گیا تھا کہ آپ اپنے لیے ہر چیز کو جائز قرار دے لیں اور دوسرے کے لیے ناجائز تو سلام ہے آپ کی اس انسانیت کو۔

دنیا کی اس اسٹیج پر ہر ایکٹر کے پارٹ پر کوئی نہ کوئی نکتہ چینی ہو سکتی۔ کیونکہ بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی کام جو ایک کی منفعت کے لیے کیا جا رہا ہے دوسرے کا اسمیں نقصان ہوتا ہے۔ اور اس لیے دنیا کے اس کاروبار میں نکتہ چینی کرنے کے بعد آدمی کو یہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

کہ میری نکتہ چینی فضول ہے اور دنیا میں ہر شخص اپنا پارٹ اتنی خوش اسلوبی سے کر رہا ہے اور اُسکا وہ پارٹ اتنا ضروری ہے کہ بغیر اسکے اس نیرنگ دنیا کی اسٹیج پر ایک ایسا ایکٹر کم ہوجاتا ہے جس سے بہتر اس خاص نوعیت میں کوئی دوسرا ایکٹر وہ پارٹ نہیں کرسکتا جو قدرت نے اس خاص شخص کے لیے وضع کیا ہے جسکے پارٹ پر جناب معترض ہیں۔

اخلاق حسین

ضروری اعلان

اس رسالہ کے متعلق یہ ارادہ کیا گیا ہے کہ انشاءاللہ اسے مستقل محنت اور کوشش کے ساتھ بتدریج ترقی دیجائے۔ شروع کے پرچوں میں آب وتاب اور غیرمعمولی دلکشی کے سامانوں سے ارادتاً پرہیز کیا گیا ہے۔ ورنہ بہت کچھ ممکن تھا۔ تدریجاً انشاءاللہ تعالیٰ اسے نہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کا علمی اور ادبی رسالہ بنانا مقصود ہے بلکہ اس سے چند اور ضروری علمی کام لینے ہیں مثلاً (۱) اُن حضرات کی قابل قدر تصنیف وتالیف کو اپنے خرچ سے چھپوانا اور شائع کرنا جو بعض مجبوریوں سے خود ایسا نہیں کرسکتے۔ جن صاحبوں کو ہمسے یہ خدمت لینی منظور ہو وہ براہ نوازش ہمسے خط وکتابت کریں جو بصیغہ راز رکھی جائے گی۔ (۲) وقتاً فوقتاً انعامی مضامین لکھوانا اور ہونہار طالب علموں کو خاص طور پر اس علمی خدمت کیطرف متوجہ کرنا اور اُن سے مضمون لکھواکر اُنکی مالی خدمت کرنا۔ بعض اوقات انعامی مضامین ہم خود تجویز کریں گے مگر جو صاحب کسی خاص مفید مضمون پر قلم اُٹھانا چاہیں اور ہم سے حق الخدمت کے متوقع ہوں وہ براہِ نوازش ہم سے خط کتابت کریں جو بصیغہ راز رکھی جائے گی۔ (۳) خریداران "تمدن" کے لیے ایک سرکیولیٹنگ لائبریری قائم کرنا۔ جس سے بہت کم خرچ میں عمدہ عمدہ کتابیں اُن کی نظر سے گذر سکیں۔

السعی منی والاتمام من اللہ

ایڈیٹر

امیر غریب

سوال۔ اے دل بے مدعا۔ یہ بھان متی کا تماشا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ بیگم صاحبہ کی سواری دور سے جاتی ہو۔ تو جہاں ہو ادب سے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اپنے دکھ درد کچھ کم ہیں جو نواب صاحب کی تندرستی کی دعائیں مانگتا ہے۔ اپنے بال بچوں سے دور پڑا ہے مگر صاحبزادے صاحب کو دیکھکر باغ باغ ہو جاتا ہے میری جان تجھ میں کیا کمی ہے جو ناظم صاحب نائب صاحب اور ڈاکٹر صاحب کو جھک جھک کر سلام کرتا ہے سچ بتا کوئی غرض تو ہمیں پوشیدہ نہیں ہے؟ یہ نہیں تو صرف امارت کا رعب ہے؟ یہ جو "آئیے حضرت" کہکر مزاج پوچھتے ہیں اس سے دل بڑھ جاتا ہے؟

دیکھ سلامت روی کے مرکز سے مت ہٹ خوشی جسکا تو بفضلہ تعالیٰ مالک ہے ریاست۔ وزارت۔ نیابت سب سے بڑھکر ہے۔ فارغ البالی جو تجھے نصیب ہے خلش والی بے انتہا دولت سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ چل۔ اس وجاہت پرستی سے مُنھ موڑ۔ گوشہ نشینی اختیار کر اللہ کا نام لے اور قناعت اور سرور دائی کی موت مرنے کے لیے مردانہ وار تیار رہ۔

جواب۔ اے پیاری روح۔ اے صدائے ربانی۔ تیری تنبیہ تیری جھڑکیوں اور لعن طعن پر ظاہر بینوں کی ہزار ہا تحسین و آفرین قربان۔ خدا تجھے قائم رکھے۔ تو نے اچھے وقت میں خبر لی۔ دل میں جو کچھ چور ہیں اُس سے تو بھی واقف ہے۔ خدا شاہد ہے بیگم صاحبہ سے بہت زیادہ عظمت دل میں اُس دکھیاری بیوہ عورت کی ہے جو چکی پیس کر اپنا بھی پیٹ بھرتی ہے

ورا پنے یتیم بچوں کا جسے تن کو کپڑا نہ پیٹ کو روٹی۔ عزت نہ آبرو۔ مگر جو۔ محنت۔ صبر اور نیکی کے ساتھ زندگی بسر کرکے حیات عظیم کے لا انتہا زنجیر میں ایک گمنام مگر بے حد ضروری کڑی ہونے کا ثبوت دے رہی ہے۔

نواب صاحب کو خدا صحت اور عمر عطا کرے۔ مگر سچ کہتا ہوں کہ ان کی جان سے ہزار درجہ زیادہ اُس شخص کی جان عزیز ہے جو غریب کنبہ۔ غریب بچوں۔ غریب عورتوں کا وارث ہے جس کو نہ کوئی تفریح درکار ہے نہ سامان عیش۔ فرض اور ادائے فرض جسکی جان عزیز کی صدائے پُر درد ہے۔ جسپر ہر امیر جس وقت چاہے ظلم کرسکتا ہے اور کرلیتا ہے جس پر ہر آفت جس وقت چاہے آجاتی ہے۔ مگر جس کے دل سے گھر بار کی فکر۔ محنت اور استقلال کا خیال ایک لمحہ بھر کے واسطے بھی جدا نہیں ہوتا۔

صاحبزادے صاحب سے کہیں زیادہ وہ معصوم بچے دل میں بسے ہوے ہیں جن کو آنکھ کھول کر نہ باپ کا سایہ نصیب ہوا ماں کا کچھوا۔ جو کسی کے سامنے مُنھ سے بھی نہیں نکال سکتے کہ ہمارا جی کیا کھانے کو چاہتا ہے اور کیا پہننے کو۔ عرش کے کنگورے اُن کے درد پر ہل جائیں تو ہل جائیں مگر بے درد دنیا ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ وزیر امرا بہت دیکھے ہیں مگر ہم تو ان سادہ مزاج سادہ حال غریبوں کے دیوانے ہیں جن کے دل خوف خدا سے لرزتے ہیں اور جنکو تصنع اور تکلف کی ایک بات بھی نہیں آتی۔

بااینہمہ - میری جان - میں تجھے بتاؤں کہ پھر کیوں بیگم صاحبہ کی سواری کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں - کیوں نواب صاحب کے لیے دعا مانگتا ہوں کیوں صاحبزادے صاحب کو دیکھکر خوش ہو جاتا ہوں - اور کیوں ناظم صاحب نائب صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے پیچھے پیچھے پھرتا ہوں -

میری جان۔ دیکھ۔ ان سے غریبوں کی عزت ہے۔ یہ بیکسوں کا سہارا ہیں اول تو یہ اچھے ہیں ہی اور اگر ابر زیادہ اچھے ہوجائیں تو غریب ترجائیں بیوائیں۔ یتیم۔ بیمار۔ محتاج۔ بے علم۔ سب ان کے ایک آنکھ کے اشارے میں ادھرسے اُدھر ہوجائیں۔ مدرسے۔ حرفت وصنعت کے اسکول۔ یتیم خانے۔ محتاج خانے۔ یہ وہ۔ اور جو کچھ ہو وہ سب ادا کرسکتے ہیں۔ جن جن ملکوں میں اور جن جن قوموں میں غریب ترے ہیں امراہی کی بدولت ترے ہیں۔ توفیق الٰہی شامل حال ہو اور غریبوں کا دکھ درد کوئی ان کو بتاتا رہے تو پھر دیکھو یہی امیر ظل سبحانی ہیں۔ یہی امیر ابر رحمت ہیں یہی بیکسوں کا سہارا اور رانڈ بیوہ اور یتیموں اور مظلوموں کی پشت و پناہ ہیں۔ خدا انھیں قائم رکھے اور نیک توفیق دے۔ آمین ثم آمین!

خوش نصیب ستارے کے تحت میں نقرئی چمچہ مُنہ میں لے کر دنیا میں پیدا ہوے ہیں۔ ان سے یہ توقع کرنی قانون فطرت کے خلاف ہے کہ یہ لوگ روکھی سوکھی کھائیں گے موٹا جھوٹا پہنیں گے۔ ریاضات شاقہ کریں گے۔ نفس کو ماریں گے اور ہر طرح غریبی سے زندگی بسر کریں گے۔ ان کا مشن پورا اور ان کی نجات محفوظ ہے اگرانکو غریبوں کے حال پر نظر ترحم رہے۔ یہی دعا ہے اور اسی لیے ان کو سلام کرتا ہوں۔

سرفراز حسین قاری۔

ایران کا ایک حسرتناک منظر

یمن سنہ ۱۹۱۰ء میں براہ کوئٹہ و بلوچستان و افغانستان سرحد ایران میں داخل ہوا اور سیستان سے ہوتا ہوا چار ماہ پندرہ روز بعد شہر مشہد مقدس میں پہنچا۔ ایک روز ایک راستہ سے میں گذر رہا تھا کہ ایک دریچۂ کلاں نظر پڑا اسکے قریب ایک چارپائی پر لاش پڑی دیکھی اور اس کے سرہانے ایک کاسہ رکھا تھا جسمیں کچھ پیسے پڑے ہوئے تھے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں یہ رسم ہے کہ جب کوئی غریب و ناداد مر جاتا ہے تو اسکی نعش کو ایسی گذرگاہوں میں ڈالدیتے ہیں تاکہ راہرو حسب مقدور کاسے میں کچھ تجہیز و تکفین کے لیے ڈالدیں۔ مقام خاص پر یہ منظر کچھ ایسا عبرتناک تھا جسکا اثر قابل بیان نہیں نہ تحریر میں آسکتا ہے۔ اُسی حالت کو مختصر طور سے ان چند اشعار میں دکھایا گیا ہے

شرر تم منھ اُٹھائے جاتے ہو کسطرف ٹھہرو — پڑا ہے راستہ میں کس کا لاشا دیکھتے جاؤ
مسافر ہے کوئی عاشق ہے کوئی یا کوئی مفلس — کوئی زخمی ہے یہ یا کوئی پیا سا دیکھتے جاؤ
تمھاری قوم کا ہے یا کوئی اقوام دیگر سے — یہ بیدردی نہیں اچھی خدارا دیکھتے جاؤ
مجھے امید ہے ہوگا تمھاری قوم کا کوئی — یقین بھی تمکو ہو جائیگا اچھا دیکھتے جاؤ
تمھاری قوم کا گر ہے تو بس گویا تمھیں تم ہو — اسے دیکھو نہ دیکھو حال اپنا دیکھتے جاؤ
پڑا ہے راستہ میں پوچھنے والا نہیں کوئی — تم اپنی قوم کی غفلت کا نقشا دیکھتے جاؤ
پڑا ہے کب سے کیونکر مرگیا کیا حادثہ گذرا — ذرا پوچھو کسی سے حال اسکا دیکھتے جاؤ
یہ کیسی رسم جاری ہے تعجب دل کو ہوتا ہے — یہی ہے قوم اسی صورت سے رسوا دیکھتے جاؤ
بہت آواز دی عبرت نے حسرت لاکھ چلائی — مگر تم نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا دیکھتے جاؤ

احسن مرزا شرر مشہدی لکھنوی

پرستان کا جلوہ

اس سچے چشم دید قصّے کا ایک حصہ اختصار کے ساتھ اودھ اخبار
میں شائع ہو چکا ہے۔ چونکہ قصّہ بہت عجیب اور دلچسپ ہے اسلیے
ناظرین "تمدن" کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ قصّے کے سچے ہونے میں
بالکل کلام نہیں"؛ ایڈیٹر

دنیا ترقی کے موٹر کار پر سوار ہے اور زمانہ بہت سرعت کے ساتھ ترقی کے منازل طے کر رہا ہے ہر طرف ہر علم و فن میں ترقی ہو رہی ہے اور سائنس اور علوم کی ترقی سے وہ چیزیں ممکن معلوم ہونے لگیں جو امکان سے بعید نظر آتی تھیں۔ ایک صدی قبل بجلی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ کسی شہر کے تمام لیمپ خود بخود ایک ساتھ روشن ہو جائیں۔ اس زمانے میں اگر کوئی شخص اس قسم کی ایجاد ہونے کا امکان ثابت کرنا چاہتا تو لوگ اسکو قیس عامری نہیں تو جارج اسٹیون سن (جس نے چلتا ہوا انجن ایجاد کیا تھا) کا سا مجنوں ضرور بنا لیتے۔ ایک صدی کا ذکر تو جانے دیجیے ایک دس برس پیچھے ہٹ کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ آلسا سے پرواز جو آج آپ کو آسمان پر اُڑتے ہوئے نظر آتے ہیں اُنکا وجود کچھ بھی نہ تھا۔ پُرانے زمانے کے قصّے کہانیوں میں بعض ایسی باتیں بیان کی جاتی ہیں کہ جو اس وقت گویا ناممکن تھیں۔ وہ لوگ جو تعلیم کی روشنی سے معمور ہو گئے ہیں بہت سے قصّہ جات کو بالکل مہمل خیال کرتے ہیں۔ میں خود ان لوگوں میں سے ایک ہوں کہ جو فسانہ عجائب اور مثنوی بدر منیر اور اسی قسم کے دوسرے قصوں کو سچ خیال کرنا انتہائی حماقت خیال کیا کرتے ہیں اور باوجودے کہ میں

میری آنکھوں کے سامنے ایک اس قسم کا واقعہ گذر گیا مگر اب گو ان قصوں کو صریح جھوٹ سمجھنے کا اعتقاد کچھ پژمردہ سا ہو گیا مگر باوجود اس مشاہدہ کے میرے اعتقاد نے ابھی اتنا پلٹا نہیں کھایا کہ میں ان کو سچ سمجھنے لگوں۔

میں اس چشم دید قصے کی ابتدا یہاں سے کرتا ہوں کہ میرے متعلقین دہلی سے لکھنؤ آنے والے ہیں آنے سے پہلے وہ مع چند اور بچوں کے شیخ ہرے بھرے صاحب کی زیارت کو تشریف لے جاتے ہیں جسوقت وہ زیارت کے لیے گئے رات کے کوئی دس بجے تھے گرمی کے دن اندھیری رات اسپر کچھ ابر غرض رات بہت بھیانک سی تھی وہاں جاتے وقت ان لوگوں کو کچھ خوف سا محسوس ہوا مگر اسکی طرف توجہ نہ کرکے یہ لوگ وہاں مزارات پر فاتحہ پڑھ کے واپس آ گئے اس رات کو دہلی میں رہ کر دوسری رات کو لکھنؤ روانہ ہو گئے لکھنؤ پہنچکر ایک رات گذر گئی دوسری رات کو یہ ساری پارٹی کوٹھے پر سوئی اور ان میں سے ایک صاحب جو اس افسانہ کے ہیرو ہیں کوٹھے ہی پر دوسری چھت پر سو گئے (صاحب افسانہ جن کا اصلی نام درج کرنے کے بجاے ہم وہ نام درج کرتے ہیں جو انھوں نے اس واقعہ میں اپنے لیے پسند کیا اور وہ بادشاہ بے وزیر ہے) رات کے کوئی ایک بجے کے قریب شدید آندھی آئی اور ابھی یہ آندھی فرو نہیں ہونے پائی تھی کہ ہمارے بادشاہ بے وزیر صاحب کی زبان سے سوتے میں بہت زور سے آواز نکلی کہ "میں نہیں جا سکتا" اس آواز کو سُنتے ہی سب لوگ چونک پڑے اور ابھی انکی طرف متوجہ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ یہ چارپائی سے زمین پر آ رہے اور فوراً ہی نہایت تیزی کے ساتھ اندھیرے میں دو کمروں کو اور ایک زینے کو طے کرتے ہوے مکان کے دروازے سے جا ٹکرائے اور وہاں سے واپس آکے وسط صحن میں گر کر بیہوش ہو گئے۔

اتنے میں کوٹھے پر سے سب لوگ نیچے پہنچ گئے اور اُن کو سنبھالا وہ بیہوش تھے سانس نہایت تیزی سے چل رہا تھا ہاتھ پاؤں ٹھنڈے اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اسی حالت میں وہ کبھی ڈرتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے پکڑو وہ مجھے مارنے آتی ہے اور کبھی غصہ ہوتے تھے اور بُرا بھلا کہہ کر زور سے چلانے لگتے کہ میں اس کو مار ڈالوں گا اور ضرور بدلا لوں گا اور جھپٹ کر بھاگنے کی کوشش کرتے تھے ایک بجے سے کوئی چار بجے تک یہ حالت رہی اسکے بعد صبح اُٹھے تو اچھے تھے ان سے دریافت کرنے پر اُنھوں نے جواب دیا کہ مجھے یہ دکھائی دیا کہ دو عورتیں جنمیں سے ایک جوان گلابی ساری باندھے ہوئے تھی نہایت انداز سے آئی یہ عورت اپنے عالم شباب میں تھی اور مجھے اسقدر حسین معلوم ہوئی کہ میں نے عمر بھر میں کوئی عورت ایسی حسین نہیں دیکھی تھی دوسری بوڑھی عورت معمولی لباس میں تھی اور اس کی شکل نہایت خوفناک تھی۔ ہمارے بادشاہ بے وزیر صاحب کو جو کوئی اُنیس برس کی عمر کے اور اوسط درجہ کی شکل وصورت کے آدمی ہیں اس حسین نوجوان نے آکر جگایا اور اُس نے خواہش کی کہ وہ اُسکے ساتھ چلیں جسکے جواب میں انھوں نے وہ فقرہ کہا کہ جو ہم سب نے سُنا اس جواب پر بڑھیا نے ان کو پٹک دیا اب صاحبزادے صاحب کے لیے ڈاکٹری علاج کا انتظام کیا گیا اور جھاڑ پھونک تعویذ گنڈا سب کچھ کیا دوسری رات کو کوئی بات قابل ذکر نہیں ہوئی مگر تیسری رات کو پھر ایک بجے صاحبزادے صاحب چونکے (اُس رات کو سب لوگ نیچے صحن میں سوے تھے) اور غصہ کی حالت میں اسی طرح کہا کہ میں نہیں جاؤں گا تم یہاں کیوں آئیں۔ یہاں سے چلی جاؤ۔ یہ چونک کر پھر دروازے کی طرف چلے مگر سب لوگوں نے ان کو پکڑ لیا۔ جب بادشاہ بے وزیر صاحب اسطرح اپنے

ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے تو انھوں نے پھر پہلے روز کی طرح گھبرانا کبھی غصّہ کا اظہار کرنا کبھی آنے والیوں کو ڈانٹنا اور کبھی کچھ خفیف سا مسکرانا شروع کیا مگر حالت میں کچھ فرق نہیں پیدا ہوا۔ کوئی دو گھنٹے تک وہی حالت رہی مگر صبح کو اُٹھے تو بالکل اچھے دریافت سے معلوم ہوا کہ آج وہ ہما گل اندام ناز و انداز سے تشریف لائیں اور پھر وہی درخواست کی۔ اگر کوئی عاشق مزاج ہوتا تو ان درخواست کرنے والی بی صاحبہ کے قدموں پر سر رکھکر اور پاؤں چوم کر ان کا غلام ہوجاتا اور ان کی درخواست تو ایک طرف خود اس سے درخواست کرتا۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔ مگر صاحبزادے صاحب نے اس مجسم حُسن کو وہی جواب دیا جو اُنھوں نے پہلے دن دنیا تجویز کیا تھا گو اس دن نوجوان حسینہ کچھ زیادہ خوشامدانہ گفتگو کر رہی تھی اور بچھی جاتی تھی مگر واہ رے بادشاہ بے وزیر کہ ان کے دل پر اُس کی خوشامد اسکے حُسن غرض اُس چیز کا کچھ اثر نہیں ہوا جو دنیا کو زیر و زبر کرنے کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو حُسن کی ایسی تحقیر کریں۔ نپولین کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی نگاہ میں حُسن کی کوئی قدر نہیں تھی مگر کسی عاشق مزاج سے اگر یہ کہو تو وہ تو اسکی ناکامیابی کا راز اسی حُسن کی بے قدری کو بتائے گا۔

دوسرا دن بخیریت گذرا یا یوں کہیئے کہ ان بی صاحبہ کے الطاف سے محروم گذرا تیسرے دن وہی ایک بجے پھر صاحبزادے صاحب کو دورہ ہوا اور جناب چارپائی کی ادوان پر کھڑے ہو کر جست کرنے کا ارادہ رکھتے تھے کہ ان کو پکڑ لیا گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر بی صاحبہ کا بھوت انپر سوار رہا

صبح کو اُٹھے تو بدستور اچھے تھے۔ انھوں نے بیان کیا کہ وہ رات کو اسی طرح دوسرے رنگ کی ساری باندھ کر آئی تھی اسکے ایک ہاتھ میں ریشمی رومال تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک دونہ جسمیں بہت خوشبودار پھول تھے اور اسکے اندر ایک عطر کی شیشی بھی تھی۔ جب انھوں نے حسب دستور اصرار اور میں نے انکار کیا تو ان کو غصہ آگیا اور انھوں نے مجھے جھنجوڑا۔ جسپر مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے اُن کے پیچھے بھاگنا چاہا۔ اس زمانے میں برخوردار مذکور کا ڈاکٹری علاج ہوتا رہا اور اسکے ساتھ تمام وہ علاج بھی ہوتے رہے جو عورتوں کے اعتقادات کے مطابق ایسے امراض میں ہوا کرتے ہیں۔

اس روز سے یہ تجویز ہوی کہ اُس وقت سب لوگ جاگ جایا کریں اور اس طرح دیکھیں کہ جاگتے میں بھی بی صاحبہ کی عشوہ گری اپنے فتنہ انگیز کرشمہ دکھاکر بادشاہ بے وزیر صاحب کو بیہوش کرکے خیالی عالم کی سیر کراتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ دو روز اسی علاج پر عمل کیا گیا اور یہ علاج کارگر ہوا اور معلوم ہوا کہ ان گل اندام حسن افروز کا حسن فسوں ساز عالم خواب ہی میں بے چارے نوجوان کو بیتاب کرکے بیہوش کردیتا ہے اور ان کی توجہ اتنی قوت دار نہیں ہے جو عالم بیداری میں کسی کے دل ودماغ پر قبضہ کرنے پر قادر ہو۔ تیسرے روز یہ تجویز ہوی کہ برخوردار کو سُلادیا جائے اور گھر بھر جاگتا رہے اور دیکھے کہ کیا گذرتی ہے۔ چنانچہ دو ہی ایک بجے صاحبزادے صاحب اس نعرے کے ساتھ "نام نام نام" نیند سے چونکے اور ان کا سانس چلنے لگا آنکھوں کی وہی حالت ہوگئی اور اس روز ایک طویل مکالمہ ہوا جس کو اس افسانہ کا حل کہنا زیادہ موزوں ہے

اس مکالمہ پر توجہ کرنے کی ضرورت یوں ہے کہ بعض وہ سوالات یا جوابات جو بی صاحبہ کی طرف سے کیے گئے اور برخوردار نے دُہرائے وہ تو معلوم ہی ہوگئے باقی سوالوں اور جوابوں کے لیے سُننے والے کو اپنے دماغ پر زور دے کر برخوردار کی گفتگو سے سوالات یا جوابات کا اندازہ لگانا پڑتا ہے جو الفاظ ہمارے بادشاہ بے وزیر کی زباں سے نکلے وہ یوں ہیں کہ اُنھوں نے کہا کہ (۱) اچھا تو تمھارا نام شہزادی واندازم فت بے نظیر ہے۔ تمھاری ہی شادی ہوگئی؟ اسکے جواب میں خبر نہیں بی صاحبہ نے کیا کہا کیونکہ اس کو برخوردار نے دُہرایا نہیں مگر تھوڑے سے توقف کے بعد اُنھوں نے کہا (۲) اچھا گلفام زماں ہے؟ (۳) اگر تم گلفام زماں سے خوش نہیں تو میں کیا کروں؟ (۴) اچھا تمھاری اماں مجھے حیران کیوں کرتی ہیں؟ (۵) اچھا وہ مرگئیں تو اُنکا سر لاکر دکھاؤ؟ (۶) وہ کمبخت کیا اگر تم بھی مرجاؤ تو مجھے افسوس نہو (۷) اچھا ہم تم سے باتیں کریں گے (۸) اچھا تمھارے باپ مرجائیں گے (۹) تم کو کیونکر معلوم ہوا کہ تمھارا باپ مرجاے گا۔ (۱۰) گلفام زماں کو سلطنت ملیگی۔ (۱۱) اجی مجھے تمھاری خدمت وغیرہ نہیں چاہیے (۱۲) میں غریب آدمی ہوں مجھے آپ کے مالامال کرنے کی حاجت نہیں (۱۳) مجھے سلطنت ولطنت کی خواہش نہیں (۱۴) گلفام زماں کو سلطنت ملے گی تو میں کیا کروں (۱۵) یہ وہ ہی سلطنت ہے جو میرے والد نے بخشی ہے (۱۶) اس دوران میں متعدد بار یہ کہتے جاتے تھے کہ تم تو تکلف کرتی ہو اور مسکراتے بھی جاتے تھے (۱۷) میں ہرگز نہیں جاسکتا (۱۸) تم نے مجھے آوارہ سمجھا ہے (۱۹) میں تمھارے لالچ میں نہیں آسکتا (۲۰) اچھا تم نے مجھے کہاں دیکھا تھا (۲۱) ہرے بھرے صاحب کے مزار پر (۲۲) میرے ساتھ عورت کون تھی۔ میری آپا اور اُنکا لڑکا

نقرہ اس واقعہ سے متعلق ہے جس سے کہ اس قصے کو شروع کیا گیا ہے (۲۳) اچھا تو تمکو مجھ سے محبت ہے (۲۴) تم کو میری کیا چیز پسند ہے (۲۵) اجی میری آنکھیں وہ نکمیں رہنے دیجیے (۲۶) ہاں ہم مکاں تو بدلنے والے ہیں (اس نقرہ کا اس واقعہ سے تعلق ہے کہ ہم لوگوں نے انداز بے نظیر اور ان کی والدہ کی عنایات سے متأثر ہو کے مکاں بدلنے کا انتظام کر لیا تھا) (۲۷) اچھا تو تم ہمارے دم کے ساتھ ہو۔ مگر خیر بہن ذرا تمیزداری سے آنا ہوگا (۲۸) میں ہرگز نہیں جا سکتا۔ تم آیا جایا کرو (۲۹) میں تمھارا نام کیا رکھوں تمھارا نام تمھارے اماں باوا نے رکھا ہے۔ اگر تم اصرار کرتی ہو تو میں تمھارا نام سنیچر رکھتا ہوں (۳۰) میرا نام بادشاہ بے وزیر ہے (۳۱) اچھا تو تمھارے یہاں عاشق ہونا ہوتا آیا ہے (۳۲) اچھا تو تم جاؤ۔ تم کہاں رہتی ہو وہاں جہاں چار انار ہیں۔ (۳۳) تم تو تکلف کرتی ہو (۳۴) اجی میں تم کو کہاں پہنچاؤں تم خود ہی چلی جاؤ (۳۵)۔ اچھا تم دو روز آتی رہیں (۳۶) کل نہ آنا اب تو ایک ہفتہ کی مہلت دو (۳۷) اچھا جاؤ۔

اس تمام گفتگو کے دوران میں سانس جلد جلد چل رہا تھا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے تھے انداز صاحبہ کے جانے کے بعد کوئی دو ہی منٹ بعد انھوں نے زور سے کہا کہ پھر آ گئی تو خبیث وہ آئی بڑھیا انداز عرف بے نظیر کی ماں ۲۔ تیرا یہاں کچھ کام نہیں ہے تو نکل جا۔ ۳۔ یہاں کمبخت انداز بے نظیر نہیں آئی جا نکل جا۔

اس کے بعد انھوں نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور تھوڑی دیر میں حالت ٹھیک ہو گئی صبح کو اُٹھے تو دریافت پر انھوں نے کہا مجھے کچھ یاد نہیں دوسرے روز مکاں بدل دیا اور کوئی آٹھ روز تک انھیں سونے نہیں دیا گیا

ایک روز سُلایا تھا کہ ایک بجے کے قریب ہی انھوں نے ایک دفعہ تسلیم کی اور پھر اسکے بعد وہ ہوشیار ہو گئے دوسری رات کو وہ آرام سے سوتے رہے۔
اسکے چند روز بعد ہمارے بادشاہ بے وزیر صاحب دہلی گئے اور وہاں ان پر سوائے اسکے اور کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا کہ وہ رات کو غائب ہو جاتے تھے اور مزارات پر حاضر ہوتے تھے۔ اب طبیعت میں ضرورت سے زیادہ اکھڑ پنا آگیا ہے۔ دہلی سے واپس پھر لکھنؤ آنے کے بعد سے بادشاہ بے وزیر پھر بدستور اچھے ہیں۔

(بزمی)

ہائے اللہ

یہ الفاظ یوں تو بہت سیدھے سادے معلوم ہوتے ہیں مگر جب ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اپنے میں کس بلا کا درد رکھتے ہیں کونسی تڑپ ان الفاظ میں مضمر ہوتی ہے جو سننے والے کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے شاید ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جس نے یہ الفاظ نہ سنے ہوں۔

عام طور پر یہ جملہ کسی مریض مصیبت زدہ۔ یا عاشق کی زبان سے نکلتا ہے۔ گویا جملہ تکلیف اور رنج کی شہادت دیتا ہے۔ مریض اپنی شدت تکلیف کے وقت "ہائے اللہ" "ہائے اللہ" کہکر خدا سے فریاد اور مدد کی درخواست کرتا ہے۔ اسطرح ایک طالب جو اپنے مطلوب سے الگ اسکے تصور میں کہیں بیٹھا اپنے زندگی کے دن پورے کر رہا ہے عالم محویت میں اسوقت جبکہ اسکے دل سے زیادہ عزیز دلدار کی یاد چٹکیاں لیتی ہے اور دل پر اس خیال سے ایک گھونسا سا لگتا ہے کہ "ہم اس سے دور ہیں اور زندہ ہیں اس گھونسے کی ضرب سے جو تکلیف اس عاشق حرماں نصیب کو ہوتی ہے اسکا نتیجہ یہی "ہائے اللہ" ہوتی ہے۔ اس ہائے اللہ کا کچھ اہل درد ہی لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ محمد ابراہیم دہلوی

غزلیات

جناب منشی سید وحید الدین احمد صاحب بیخود دہلوی جانشین حضرت داغ مرحوم

اُٹھے تری محفل سے تو کس کام کے اُٹھے — دل تھام کے بیٹھے تھے جگر تھام کے اُٹھے
دم بھر مرے پہلو میں اُنھیں چین کہاں ہے — بیٹھے۔ کہ بہانے سے کسی کام کے اُٹھے
افسوس کہ اغیار نے کیا کیا نہ کئے ہاتھ — وہ بزم سے جب ہاتھ مرا تھام کے اُٹھے
دنیا میں کسی نے بھی یہ دیکھی ہے نزاکت — اُنسے نہ کبھی حرف مرے نام کے اُٹھے
اس بزم سے اُٹھکر تو قدم ہی نہیں اُٹھتا — گھر صبح کو پہنچے ہیں کہیں شام کے اُٹھے
جو ظلم و ستم تم نے کیے سب وہ اُٹھائے — اک رنج و قلق ہم سے نہ الزام کے اُٹھے
صدمے تو بہت قید میں جھیلے مرے دل نے — جھٹکے نہ مگر زلفِ سیہ فام کے اُٹھے
ہے رشک کہ یہ بھی کہیں شیدا نہوں اسکے — تربت سے بہت لوگ مرے نام کے اُٹھے
افسانۂ حسن اُسکا ہے ہر ایک زباں پر — پردے نہ کبھی جسکے در و بام کے اُٹھے
آغازِ محبت میں مزے دل نے اُڑائے — پوچھے تو کوئی رنج بھی انجام کے اُٹھے

دل نذر میں دے آئے ہم اک شوخ کو بیخود
بازار میں جب دام نہ اس جام کے اُٹھے

ارمان اگر نکلے ارمان کا کیا کہنا — احسان کرو دل پر احسان کا کیا کہنا
معشوق سہی پریاں مشہور سہی حوریں — انسان ہے کیا نسبت انسان کا کیا کہنا
اُس بات کی ضد کیسی جو سُن نہ سکے کوئی — ارمان ہے چڑ اُنکی ارمان کا کیا کہنا
پوشیدہ رہا دل میں اللہ رے ترا پردہ — ہر شے میں نظر آیا اس شان کا کیا کہنا
ہے جان کا غم زاہد اس بت کی محبت میں — ایمان سلامت ہے ایمان کا کیا کہنا

میں خاک میں ملکر بھی پاتا ہوں اُسے دل میں — اُجڑے ہوئے گھر میں ہے مہمان کا کیا کہنا
خط میں مجھے لکھا ہے دشمن سے ملو جا کر — قسمت کا نوشتہ ہے فرمان کا کیا کہنا
میں اُنسے شبِ وعدہ دیوانہ نہیں کہہ کر — جب پاس گلا گھونٹے ارمان کا کیا کہنا
کیا بات ہے اُس دل کی تو جس میں سما جائے — قربان ہو جو تجھپر اس جان کا کیا کہنا
چٹکی میں ہے تیر ابتک چٹکی سے نہیں چھوٹا — آنکھوں میں کھٹکتا ہے پیکان کا کیا کہنا

بیخود کی دلبری سے گُم ہوش ہیں قاتل کے
قدموں ہی پہ دم توڑا اوسان کا کیا کہنا

جانشین میرزا غالب ۔ حضرت ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی

روتے روتے شام ہوئی ہے کبتک خون بہائینگی — بہتے بہتے تھمتے ہیں دریا آنکھیں بھی تھم جائینگی
جاتے جاتے جسم سے جائیں اہلِ وفا کی جانیں گی — آتے آتے دل لینے کی تم کو گھاتیں آئیں گی
اُلٹی اُلٹی باتیں اُنکی مقصد تک پہنچائیں گی — سیدھی سیدھی راہیں مجھکو باتوں میں ٹل جائینگی
چونکو چونکو خواب غفلت سے ایام جوانی میں — اُٹھو اُٹھو سونے والو راتیں پھر بھی آئیں گی
آؤ آؤ قتل کے بعد اب دفن میں جلدی کاہے کی — بیٹھو بیٹھو دم تو لے لو لاشیں بھی اُٹھ جائینگی
آئیں آئیں ساری بلائیں صدقے ہوں ویرانے کے — مٹتے مٹتے مٹینگے ہم اب کسکی خاک اوڑائینگی
لاتے لاتے دام میں الفت لائیگی زنجیروں کو — بڑھتے بڑھتے زلفیں تیری طوق کمر ہو جائینگی
بھرتے بھرتے آہوں کو دل خالی کر ہی ٹالینگے — جلتی جلتی زنداں سے اب گرم ہوائیں آئینگی
بیٹھے بیٹھے دیکھے جاؤ الجھن وقتِ آخر کی — چپکے چپکے میری سانسیں کچھ تمکو سمجھائینگی
ٹکرا ٹکرا کر یہ ناوک خاک سے مجھ تک آئیں گے — نیچی نیچی اُنکی نگاہیں میرا دل پا جائینگی
ہوتے ہوتے ہوگا ظالم واقف رسمِ الفت سے — رفتہ رفتہ میری وفائیں راہ پر اُسکو لائینگی
بگڑے بگڑے تیور اُنکے عقدہ لاحل ہوں لیکن — بنتے بنتے اُنکی زلفیں یہ گتھی سلجھائیں گی
رکھے رکھے تیر و کماں کو چھوڑ گئے دل مشتاقوں کے — نازک نازک باہیں تیری لو قاتل تھک جائینگی

سنتے سنتے میرے نالے دل اُنکا بھر آیا ہے
اللہ اللہ آج تو آہیں جی میں بہت اترائینگی

مخفی مخفی ظلم کیے تھے پردہ اُلٹا محشر نے
کیسے کیسے راز کھلے ہیں اب آنکھیں شرمائینگی

اُبلے اُبلے شیشے مے کے بزم میں ساقی لایا ہے
اُلٹے اُلٹے جام ہوے اب آنکھیں شرمائینگی

مانو مانو کہنا مانو آئینگے وہ خود دل تھامے
ثاقب ثاقب آہیں تمھاری کھینچکے اُنکو لائینگی

مومن ثانی جناب مولانا مولوی محمد عبدالرحیم صاحب کلیم لکھنوی

خامہ کتاب عشق سے وہم و خیال کی
تصویر کھینچ دیتے ہیں رنج و ملال کی

وقت خوشی زیادہ ہے حاجت ملال کی
ملتی ہے چھیڑ چھاڑ سے لذت وصال کی

ذکر فراق چھوڑیے شب ہے وصال کی
ناصح سے ہو سکے گی نہ گرداں حال کی

اچھا طواف تھا کہ لحد پائمال کی
ظالم کی چال نے یہ قیامت کی چال کی

تجھکو خبر ضرور ملی میرے حال کی
چھپتی نہیں چھپائے سے صورت ملال کی

آتی نہیں ہے وہم میں وسعت خیال کی
ملنے لگی فراق سے لذت وصال کی

ظالم نے جب سے میری لحد پائمال کی
گردوں زمین ہو گیا گرد ملال کی

وحشی کو تیرے ہوش ہے انجام عشق کا
سب کچھ خبر ہے بیخبری میں مآل کی

کیوں بار بار پوچھتا ہے مدعا مرا
صورت سوال ہے نہیں حاجت سوال کی

ناصح ہماری وحشت دل کو نہ کھو سکا
تردید کر سکا نہ ہمارے خیال کی

دریاے رحمت اُسکا ابھی آئے جوش میں
اک بوند اگر گرے عرق انفعال کی

وہ اور میری یاد میں اور اُسکو بھول جاؤں
قاصد یہ ساری باتیں ہیں خواب و خیال کی

تیر نگہ ایک زنگ سے بھی آشکار ہے
جو ہجر کی ہے شب وہی شب ہے وصال کی

بالکل نظر نہیں ہے اُسے میرے درد پر
مطلق خبر نہیں ہے اُسے میرے حال کی

عیش اپنا اُسنے ترک کیا میرے واسطے
ہر وقت فکر رہتی ہے اُسکو ملال کی

س بدگماں سے دشت میں وحشت رہی مجھے
دیکھیں نگاہ بھر کے نہ آہیں غزال کی

ے مزاج اپنی طبیعت سے تنگ ہوں
کوئی گھڑی خوشی کی ہے کوئی ملال کی

ردہ اسکا سین واو الف لام سے کھلا
ہے ابتدا حروف ہجا سے سوال کی

رقت زدوں کا تیرے یہی زادِ راہ ہے
دنیا سے لیکے جاتے ہیں حسرت وصال کی

حمت سے اُسکی ابرِ کرم ہے بروزِ حشر
تر دامنی مرے عرقِ انفعال کی

وش چشم تیری چشم سے تڑپیں نہ کس طرح
تیرِ نظر کے زخم ہیں آنکھیں غزال کی

رتے ہیں اپنے رُخ کی کتابی کا وہ ادب
تمہید ہے یہ بوسۂ رُخ کے سوال کی

پنی نظیر آپ ہے تو دیکھ آئینہ
حاجت مشاہدہ میں نہیں احتمال کی

دیے ہیں بیگنہ کو بھی بے گر گنہگار
کچھ حد نہیں رہی عرقِ انفعال کی

سائل نے اپنے نفس کو مارا نہ کس لیے
تلوار کیوں نہ کھینچ لی دستِ سوال کی

گویا جناب یوسف ابھی تک ہیں چاہ میں
تجھ سے عیاں ہوی یہ بلندی جمال کی

سارا زمانہ حشر میں اپنی کہا کیا
فرصت نہ دی کسی نے مجھے عرضِ حال کی

دریا اُدھر ہی بہتا ہے جس سمت ہے نشیب
حاجت ہے دستِ جود کو دستِ سوال کی

جلوہ ہے اسکا آنکھ میں بھی اور دل میں بھی
حاجت کلیم کو نہ رہی دیکھ بھال کی

لسان القوم مولانا صفی صاحب لکھنوی مدظلہ العالی

دیکھیے کیا ہم اسیروں پہ بلا آتی ہے
آج کچھ روزنِ زنداں سے ہوا آتی ہے

کس طرح دیکھیے زنداں میں قضا آتی ہے
روشنی آتی ہے جیسیں نہ ہوا آتی ہے

گوشِ مجنوں میں یہ لیلےٰ کی صدا آتی ہے
چھوڑ دو پردۂ محمل کہ ہوا آتی ہے

بسترِ غم پہ الٰہی دلِ بیمار کی خیر
کچھ مرے کان میں رہ رہ کے صدا آتی ہے

خون ہو کر بھی نہ بدلا دلِ بیتاب کا رنگ
سانس لیتا ہوں جہاں بوئے وفا آتی ہے

مہرباں جو مری قسمت میں لکھا تھا وہ ہوا
آپ شرمندہ نہوں مجھکو حیا آتی ہے

یہ بھی چھپتے بھی نہیں آکر سرہانے وہ کبھی
جن کو بیمار محبت کی دوا آتی ہے

میرے پہلو میں ٹھہر جائے تڑپتا ہوا دل
تجھکو ظالم کوئی ایسی بھی ادا آتی ہے

ڈالنے پاؤں میں شوریدہ سروں کے زنجیر
آج پھرتا ہے کمر زلف رسا آتی ہے

کیجیے چل کے ذرا بتکدۂ حسن کی سیر
ذرہ ذرہ میں نظر شانِ خدا آتی ہے

آنکھیں سلوائی گئیں شکوۂ بیخوابی پر
ہم نے چاہا تھا کہ نیند آئے قضا آتی ہے

رات بھر خواب پریشاں نظر آتے ہیں صفیؔ
نیند کیا آتی ہے گویا کہ بلا آتی ہے

جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشرؔ لکھنوی

اثر شادی و غم کا رفتہ رفتہ یوں مٹا دل سے
ہنسی کا ذکر کیا رونا بھی آتا ہے تو مشکل سے

یہ کہکر روح نکلی ہجر میں رگہائے بسمل سے
ورق ہستی کا اُلٹا شدت بیتابی دل سے

کسے ناخواندہ مہماں کہتے ہیں پوچھو مرے دل سے
نکلوایا گیا اکثر یہ معشوقوں کی محفل سے

دیارِ عشق میں بجلی کا گرنا سب نے دیکھا ہے
کسی کی شوخیوں سے اُدھر بیتابیِ دل سے

ہنسی آتی ہے مجکو چارہ سازوں کی توجہ پر
سمجھ لینگے خدائی راز گویا نبض بسمل سے

مصیبت اپنی اپنی اہل محشر بھولے جاتے ہیں
وہ باتیں بے تکلف چھڑ گئیں مقتول و قاتل سے

فلک کے دور میں کیا جانیں کیسا انقلاب آئے
قرینِ مصلحت ہے دور رہنا اُنکی محفل سے

مجھے مارا تلاش دوست کی ناکامیابی نے
بنائی جائے تربت بھی غبار راہ منزل سے

جوانی کی قسم کھا کر وہ سوئے ہیں چلکیں گے
خدائی کانپ اُٹھی فرقت کی شب بیتابیِ دل سے

غم فرقت کی تاثیر اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی
کہ ہم نے اپنے دلکو خود بھی پہچانا ہے مشکل سے

سفینے کو خدا حافظ نہ کہیے پھر تو کیا کہیے
کہ موجیں مثل پیغام اجل آتی ہیں ساحل سے

نکالا قدرت جذبات حسن و عشق نے مل کر
مہ کنعاں کو اپنے گھر سے اور لیلی کو محمل سے

وہ ساعت آگئی دنیائے منقلب ہوگی
حضور اُٹھ جائیے منھ پھیر کر پہلوئے بسمل سے

مری جان تم سے سوجتنے تمہارا تیر بہتر ہے
بظاہر دشمن جان اور باطن میں طلاطل سے

وہ خوش تقدیر کیونکر بیٹھنے پائیں دم بھر
نہ پھیجا ما مزاج دوست جنسے رنگ محفل سے

کیا موسیٰ نے وہ کار نمایاں جو نہ ممکن تھا
اُبھارا نقش برق حسن کو بیتابیٔ دل سے

حیات عشق میں محشر خدا وہ دن نہ دکھلائے
کہ جانا اور پھر زندہ پلٹنا کوئے قاتل سے

جناب منشی نوبت رائے صاحب نظر ایڈیٹر اودھ اخبار

فرقت میں کسقدر ہم مشتاق تھے اجل کے
کیا روح خوش ہوئی ہے اس جسم سے نکل کے

آوارہ کسقدر ہیں دو چار اشک حسرت
رُکتے نہیں یہ چلکے تھمتے نہیں نکل کے

کیا کوئی دل شگفتہ ہو اُسکی خوابگہ میں
جب غنچے ہو گئے ہوں بستر کے پھول ملکے

اے انقلاب عالم تو بھی گواہ رہنا
کاٹی ہے عمر ہمنے کروٹ بدل بدل کے

اُٹھے گی لاش میری ہمراہ ہونگے وہ بھی
بیٹھے ہیں اہل عالم گھر سے نکل نکل کے

لے نکلی اس جہاں سے فرقت کی بیقراری
پہنچے میان محشر ہم کروٹیں بدل کے

میرا ہی دامن اُسنے آنکھوں پہ میری رکھا
مجھسے سوا ہیں نادم آنسو مرے نکل کے

کسطرح جان دی ہے فرقت میں کیا بتاؤں
کرنا پڑے ہیں مجھکو جو کام تھے اجل کے

جو پائے صبح وصلت ہوائے نظر اگر تم
کاٹو شب جدائی کروٹ بدل بدل کے

جناب قاضی عبدالعزیز صاحب عزیز۔ بی اے۔ ایڈیٹوریل اسٹاف اودھ اخبار لکھنؤ

میں کہتا ہوں کہ تم دل لیگئے، وہ دلستاں تم ہو
اگر سمجھو مرے حق میں بلائے ناگہاں تم ہو

مجھے کہتے ہو جو کچھ تم سمجھ کر بزم میں کہنا
زبان تم، کان تم، دل تم، مرے روح رواں تم ہو

مرے صحرا، ترے آباد کوچے کو خدا رکھے
تمہارا نام روشن ہو وہاں میں ہوں یہاں تم ہو

شکایت مجھسے دنیا کو شکایت مجھکو دنیا سے
مرے مٹنے کی دنیا تم زمیں تم آسماں تم ہو

کسی سے حالِ دل کہنا عبث معلوم ہوتا ہے
دوائے دردِ تم، نا مہرباں تم مہرباں تم ہو

ہمارے قلب مضطر کیلئے تم بھی مضطرب ہوگے
تمہارا ہم سے رم کرنا کہے دیتا ہے ہاں تم ہو

کہوں گا راز دل تم نے مجھے بھی تم سے کہنا ہے
مگر یہ سوچ لو دل میں کہ مجھسے بدگماں تم ہو

نہ چھپ سکتے ہو چھپنے سے نہ کھل سکتے ہو کھلنے سے
جو سوچو تو شکل ہو ظاہر جو دیکھو تو نہاں تم ہو

کسی مرقدسے خاک اٹھنا جواب اس بات کا ہوگا
ارے تم چاہنے والے مرے یوں بے نشاں تم ہو

مری حیرت نے حیرت میں انہیں خود ڈال رکھا ہے
وہ مجھسے پوچھتے ہیں دیکھنے والے کہاں تم ہو

قسم تم کو اسی سر کی کبھی دل سے ہمیں چاہا
عزیز اکثر کہا کرتے ہو ہم سے دلستاں تم ہو

جناب منشی مقبول حسین صاحب ظریف لکھنوی

بگولے ناچتے تھے نجد میں وہ قیس عریاں تھا
یہ سب کیا تھا فقط لیلےٰ کی دلچسپی کا ساماں تھا

مرا دل ڈاک بنگلہ اور تصور خانساماں تھا
خیالِ یار جنٹلمیں کی صورت میہماں تھا

جنوں اک شعبدہ تھا سیرِ خاک اڑتے ہوئے اکثر
کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا

ابھی فرہاد تو تھا بھرتیا اور قیس تھا کنجر
وہ رہتا تھا پہاڑوں پر مکاں اسکا بیاباں تھا

منڈا کر ہو گیا وہ فارغ البال انکی الجھن سے
مرا معشوق زلفوں سے بہت اپنی پریشاں تھا

خواتین کی خدمت میں "تمدّن" کی التجا

منجملہ اور خدمات کے "تمدّن" نے حقوق نسواں کی حمایت کی بھی ایک خدمت اپنے ذمہ لی ہے ابتک خدا کے فضل سے اس خاص خدمت کی ضمن میں بہت کچھ کیا ہے۔ اور اسیلئے ہم مجاز ہیں کہ فرقۂ اناث سے درخواست کریں کہ وہ سابق کی طرح اپنے رشادِ قلم سے "تمدّن" کو مزین اور ناظرینِ "تمدّن" کو محظوظ فرمائیں اور مجھے ممنونیت کا موقع دیں۔ امید ہے کہ فرقۂ اناث کی طرف سے بھی اسی قدر مضامین ہم کو موصول ہونگے جتنے طبقۂ ذکور کی طرف سے وصول ہوں گے۔

ایڈیٹر

تمدّن کا لکھنوی دور

ناظرین تمدن کو عم مکرم مولانا عبدالراشد صاحب الخیری کے اس اعلان سے جو انہوں نے گذشتہ پرچہ میں کیا ہے علم ہوا ہوگا کہ انہوں نے ازراہ کرم تمدّن کو اس امید پر مجھے دیدیا ہے کہ مَیں اسکی اصلی شان کو پھر قائم کردوں اور از سر نو پبلک کی ان امیدوں کو انشاء اللہ پورا کرنے کی کوشش کروں جو ناظرین اس چھوٹے سے رسالہ سے وابستہ کرسکتے ہیں مگر یہ ظاہر ہے کہ میں اپنی تمام کوششوں میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک ملک کے مشہور اہل قلم اپنے رشادِ قلم سے اس ادبی رسالہ کی امداد نہ کریں اور آپ ناظرین اسکی توسیع اشاعت کی کوشش نہ کریں۔ ایک کام اگر دو شخصوں پر منقسم ہو اور دونوں شخص اپنی اپنی قابلیتوں کو کام میں نہ لائیں تو وہ کام ادھورا کیا کچھ بھی نہ ہوگا اگر میں ناظرین سے یہ توقع کروں کہ وہ باوجود میری بے قاعدگی اور رسالہ میں عمدہ مضامین نہ ہونے کے رسالہ کی خریداری کرتے رہیں تو یہ میری غلطی ہوگی اس طرح اگر پبلک اور اہل قلم حضرات مجھ سے اپنے فرائض کی انجام دہی چاہیں تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس حد تک بر سر حق ہوں گے۔ میں پبلک سے توسیع اشاعت اور ملک کے اہل قلم سے مضمون لکھنے کی درخواست کرتے وقت بھی اس امر کا متوقع ہوں کہ ثمرات ضرور میری امیدوں کے مطابق ہوں گے اور انشاء اللہ اب یہ "تمدّن" اُردو داں ہندوستان کے تمدّن ہی نہیں بلکہ ادب۔ معاشرت اور دیگر اہم باتوں کے لیے ایک راہبر ثابت ہوگا اور اسکے ساتھ ہی ساتھ زبان اُردو زبان کی خدمت کرے گا

"تمدن" کا پرچہ ارسال خدمت ہے امید کہ ناظرین ہم کو فوراً دوسرا پرچہ بذریعہ وی پی روانہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے۔

مجھے یہ پرچہ ۳۰۔ اگست کو ملا اور اس کے ساتھ دو مضمون ملے جنہیں سے ایک "تمدن" کی پالیسی کے کچھ بہت مطابق نہیں تھا۔ ۳۰۔ اگست کو مجھے معلوم ہوا کہ اگست کا پرچہ مجھے نکالنا ہے۔ اس قلیل مدت میں پریس وغیرہ کے انتظام کرنے کی دقت اور لکھنؤ لانے کی مشکلوں کو طے کرکے جو کچھ کر سکا وہ حاضر خدمت ہے۔ یہ ممکن ہے کہ میں اس پرچہ میں اپنے ان وعدوں کو پورا نہ کر سکا ہوں جو میں نے کئے ہیں مگر اس قلیل مدت اور کام دونوں کو پیش نظر رکھ کے ناظرین خود مجھے قابل معافی تسلیم کریں گے۔

"تمدن" کے دہلوی دور میں بعض اوقات دو ماہ کا ایک پرچہ نکالا گیا ہے میں نے سوچا تھا کہ میں ہرگز ایسا نہ کروں گا چنانچہ میں نے یہ انتظام کیا کہ اگست کا پرچہ ۱۵ ستمبر کو نکال دوں اور ستمبر کا پرچہ ۳۰ اکتوبر کو پوسٹ کردوں تاکہ وہ ٹھیک وقت پر ناظرین کو مل سکے اور اس طرح باقاعدہ ٹھیک وقت پر نکلنے لگے۔ ۱۵ تاریخ کے بعد تک جون اور جولائی کے پرچے جو مولانا عبدالراشد صاحب الخیری کو نکالنے ہیں نہ نکلے تو مجھے مجبوراً اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اگست اور ستمبر کا پرچہ میں ایک ہی نکال دوں اور گویا اس دن سے اشاعت ٹھیک وقت پر ہونے لگے یہ بھی خیال تھا کہ اگست کا پرچہ ۳۰ ستمبر کو نکال دیا جائے کیونکہ اس سے قبل تو وہ اس وجہ سے نہیں نکل سکتا تھا کہ اس سے چند ہی روز پہلے جون اور

جولائی کے پرچے نکلے تھے اور ۱۵ اکتوبر کو ستمبر کا پرچہ شائع کیا جائے مگر میری طبیعت دو پرچوں کو تاریخ مقررہ کے بعد شائع کرنے کی اجازت نہ دے سکی اور ایک ہی نمبر کو ناوقت ہونے کی وجہ سے دوسرے پرچے کے ساتھ ملا دینا مناسب جان کر یہ دو پرچوں کا ایک رسالہ حاضر خدمت ہے۔ گو "تمدّن" کے لکھنوی دور کے پہلے ہی پرچے کا ڈبل نکلنا بہت بُرا شگون ہے مگر انشاء اللہ لکھنوی دور کا یہ ڈبل نمبر پہلا اور اخیری خود ہی ہوگا۔ وی۔ پی بھیجنے کی اجازت کا کارڈ رسالہ میں رکھ دیا گیا ہے۔ براہ کرم آپ اس پر صرف نام و پتہ تحریر فرما کر روانہ کردیں پرچہ جناب کے نام جاری کردیا جائیگا ناظرین سے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم پابندی وقت کا اسقدر خیال رکھیں گے کہ انشاء اللہ آئندہ کم از کم اس بات کی ناظرین کو کبھی شکایت نہ ہوگی۔

چونکہ پرچہ نسبتاً دیر میں شائع ہو رہا ہے اس سے ہم نے رعایت کے زمانے کو بڑھا دیا ہے اور اب ۳۰ اکتوبر کی جگہ ۱۵ اکتوبر تک نئے خریداروں کو پرچہ تین روپیہ چھ آنہ (۳؍۶) کے بجائے تین روپیہ (۳) سالانہ میں ملے گا۔

ایڈیٹر

عرضداشت

خط وکتابت کے وقت "تمدّن" کا موجودہ پتہ تحریر فرمائیے۔

دلّی کی ڈول والیاں

آپ نے سنا ہوگا کہ کبھی دہلی کی خواتین مذاق کی نفاست سلیقہ شعاری اور ہنرمندی میں شہرہ آفاق تھیں۔ وہ بات اگرچہ اب نہیں رہی لیکن جو کچھ کھرچن باقی رہ گئی ہے وہ بھی فی زمانہ کچھ کم نہیں یہی وجہ ہے کہ

خاتون اسٹورز دہلی

کی بنائی ہوئی چیزیں ملک کے ہر گوشہ اور ہر طبقہ میں خصوصیت سے پسند کیجاتی ہیں شوقین ان سے حظ اٹھاتے ہیں بہت سے گھروں کی ضروریات ان سے پوری ہوتی ہیں اور دیکھنے والے ان کی داد دیتے ہیں۔

برقعہ نو ایجاد دہلی ایسی چیز ہے کہ جس پر متعدد **طلائی و نقرئی تمغے** اور گرانقدر انعامات حاصل ہوئے ہیں۔ اس برقعہ کی عکسی تصویر آپ اسٹورز کی فہرست منگا کر دیکھ سکتے ہیں۔

ہمارا مکانی پتہ **خاتون اسٹورز دہلی**

گفتارِ بیخود

دلی کے "چمنستانِ شاعری" کا ایک گل۔ گل افشانی کرتا ہے، اور آپ ان پھولوں کو نہیں چنتے: کیا یہ ممکن ہے؟ کیا آپ نے کبھی کے منہ سے پھول جھڑتے دیکھے ہیں؟ "نہیں دیکھے" تو آپ جناب منشی سید **وحید الدین** صاحب **بیخود** دہلوی جانشین حضرت داغ کا دیوان دیکھئے جو آج دس برس کے بعد چھپ رہا ہے۔ دیوان کی تعریف ہم نہیں کرتے کیونکہ وہ اپنی تعریف خود آپ سے کرائیگا ضخامت تقریباً ۲۰ جزو قیمت عہ اور جو لوگ پیشگی قیمت ادا کریں اُن سے صرف ایک روپیہ۔

حضرت بیخود کی نثر کا نمونہ دیکھنا ہو تو آپ ہم سے انکا بے مثل دلنا یاب ناول

"ننگِ ناموس"

طلب فرمایئے جس میں پردے کی پورے طور پر حمایت کی گئی ہے اور جسپر دربار رام پور سے گرانبہا انعام مل چکا ہے قیمت ۸/

سفرنامہ قاری

اس تحریر میں میری اُن کوششوں کا ذکر ہے جو میں نے توفیق ایزدی سے اشاعت اسلام کے لیے کی ہیں۔ اور تمہید کے طور پر بعض وہ حالات درج ہیں جنھوں نے مجھے اس مقدس کام کی طرف متوجہ کیا۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں علیگڈھ کالج چھوڑنے اور کسٹم کے محکمہ کی نوکری اختیار کرنے کے بعد کئی سال تک مجھے کسی بات کا خاص طور پر شوق نہ ہوا۔ سب سے زیادہ امتیازی بات میری یہ تھی کہ میں اپنے دوستوں کو ہنساتا اور اس خوشگوار فن کے جسقدر متعلقات ہیں اُن میں ترقی کرتا رہتا تھا۔ نظم۔ نثر۔ مذاق۔ تفریح یہ مشغلے پیٹ کے دھندے کے بعد کسی وقت پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ حسن و عشق اور تصوف کی باتوں سے سرے سے لگاؤ تھا۔ میلے تماشوں۔ عرسوں اور قوالی کی مجلسوں میں اکثر جاتا تھا اور کبھی کبھی حال بھی آتا تھا۔ چشتیہ نظامیہ فخریہ میں بیعت ہوچکا تھا اور باوجود تفریحی مشاغل کے نماز اور تھوڑا بہت وظیفہ ضرور پڑھ لیتا تھا۔ شادی پہلے ہی ہوچکی تھی اور کثیر العیالی کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ ایک طرف تو اپنے ہم عمر دوستوں کی تفریحی صحبت دن رات ملتی تھی مگر دوسری طرف بڈھوں اور بزرگان دین کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ مذہبی بحث مباحثے اور فرقہ بندی کی باتوں سے طبیعت کو نفرت تھی۔ پبلک جلسوں میں تقریر کرنے کا یا کچھ پڑھنے کا بیحد شوق تھا۔ کالج کے زمانے میں یونین کے مباحثوں میں اکثر حصہ لیتا تھا اور کیمبرج سپیکنگ پرائز بھی حاصل کیا تھا اسٹیجوں کی مذاقیہ نظمیں اکثر لکھا کرتا تھا۔ مشاعروں میں غزلیں بھی بہت

پڑھی ہیں۔ مولودخوانی اور مرثیہ خوانی بھی کی ہے۔ شاعری میں مولوی سیف الحق صاحب ادیب دہلوی کا شاگرد تھا۔ اپنے وطن دہلی (یعنی عربک اسکول) میں جناب مولانا حالی صاحب مرحوم سے اور علیگڈھ کالج میں مولانا شبلی صاحب مرحوم اور یوروپین صاحبان میں مرحوم مسٹر آرنلڈ۔ مسٹر (اب سر) تھیوڈور ماریسن اور مسٹر آرنلڈ سے فخر تلمذ رہا۔

خدا کے فضل سے بیوی بہت سیدھی سادی اور مطیع و فرمانبردار ملی تھیں خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت دے کبھی اللہ کی بندی نے یہ شکایت نہ کی کہ تم رات رات بھر مشاعروں اور جلسوں میں کیوں رہتے ہو۔ الغرض ایسے استادوں سے پڑھکر۔ ایسی صحبتوں میں رہ کر اور گھر کی طرف سے اسقدر آزادی پاکر میں ایک معجون مرکب بنا جس کا تھوڑا بہت اندازہ آیندہ صفحات سے ہوگا۔ کالج چھوڑ کر اور نوکری کے سلسلے سے میرٹھ آن کر ڈپٹی نجم الدین صاحب مرحوم کی صحبت میں خاص طور سے بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے مکان پر نہایت پاک صحبت جمع ہوتی تھی مولوی گل حسن صاحب مولوی عبدالحکیم صاحب مرحوم اور مولوی محمد اسمعیل صاحب کا مقدس جمگھٹا یہیں رہتا تھا۔

یہ سب بزرگ حضرت مولانا غوث علی شاہ صاحب پانی پتی کے نظر یافتہ تھے اور تصوف کا دن رات چرچا رہتا تھا۔ توحید تنزیہی اور قلندرانہ رنگ کی باتیں یہاں اکثر ہوتی تھیں مگر ہر بزرگ شریعت حقہ کا متبع اور اتقاء میں درجۂ امتیاز رکھتا تھا۔ ان صاحبوں کی صحبت خصوصاً ڈپٹی نجم الدین صاحب مرحوم کا رنگ مجھپر چڑھنا شروع ہوا۔ ڈپٹی صاحب مثنوی شریف کے حافظ اور ماہر تھے اور اکثر اسکے نکات بیان فرماتے تھے۔ ہنود کے تصوف سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے۔ اور اکثر اپنے ہاں کی اور ہندوؤں کے تصوف کی باتیں ملاکر بیان

کیا کرتے تھے - مجھے بھی اسی مخلوط تعلیم کا شوق ہوگیا - رفتہ رفتہ ہندو فقیروں اور سادھوؤں کی صحبت میں بھی جانے لگا - اور عیسائی پادریوں سے بھی ملنے لگا - ایک ہندو فقیر تو ایسے ملے جنھوں نے ترک حیوانات کرادیا اور پانچ مہینے اُس غذا پھلکا جسے ست گنی بھوجن کہتے ہیں - گھر والے تنگ تھے سب کے لیے الگ پکے میرے لیے الگ - اکثر دوست عموماً اور گھر والے خصوصاً ڈرتے تھے کہ کہیں یہ ہندو نہ ہو جائے -

ان ہی دنوں میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا اور اخلاقی ناول تصوف کے رنگ میں لکھے مگر ہر ناول میں یہ واحد خصوصیت ضرور تھی کہ طوائف مجالس رقص و سرود اور تصوف کا ذکر ہوتا تھا - میرے ناولوں کی دوستوں نے خوب تعریف کی - اس سے قدم آگے بڑھایا تو انجمنوں اور کانفرنسوں میں لکچر دینے اور اخبارات میں مضامین لکھنے شروع کیے - ان مشاغل سے فائدہ تو ہوا یا نہ ہوا مگر اسقدر نقصان ضرور ہوا کہ مذاق آفرینی کا مادہ کم ہونا شروع ہوگیا - اسی زمانے میں اتفاق وقت سے چکاگو ملک امریکا میں جو عالمگیر نمائش کے موقع پر مذہبی جلسۂ اعظم ہوا تھا اُسکی رپورٹ کا ریویو میری نظر سے گذرا اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مشہور بزرگ سوامی وے ویکانند جی جنھوں نے وہاں ویدانت یعنی اہل ہنود کے تصوف تنزیہی کا وعظ فرمایا تھا وہ سب واعظوں پر فوق لیگئے اور اسلام کا وعظ جو امریکن نومسلم مسٹر رسل ویب کیا تھا اُسپر لوگوں نے التفات نہ کیا - دل میں اسکی کریدنی پیدا ہوی اور سوامی جی کے جتنے مطبوعہ انگریزی لکچر تھے منگا کر پڑھے - گیتا اور تھیو سوفی کی کتابیں بھی پڑھیں اور یہ رائے قائم کی کہ امریکا میں اسلام کے تصوف تنزیہی کی اشاعت کی جائے - چنانچہ کئی سال تک اس کام کے لیے ضروری

علمی تیاری کی اور انگریزی میں محاسن اسلام پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا اور امریکا کے مذہبی رسالوں میں اُسے چھپوایا۔ یہ بھی ارادہ ہوا کہ خود امریکا جاکر جابجا لکچر دوں مگر یہ ارادہ پورا نہو سکا۔ تاہم یہ خیال دل میں جگہ پکڑ گیا کہ نئی روشنی کی ضرورتوں کے موافق مذہب کا وعظ کیا جائے۔ بنا برآں متھرا کے جلسۂ مذاہب اعظم میں جو غالباً سنہ ۱۹۰۰ء یا سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوا تھا اللہ کے فضل سے بڑی کامیابی کے ساتھ محاسن اسلام پر لکچر دیا۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں نوکری پر سے تین مہینے کی رخصت لے کر علیگڈھ کالج میں آکر رہا اور متعدد لکچر اسلام کی خوبیوں پر دیے۔ دسمبر سنہ ۱۹۰۲ء کی ایک یادداشت مجھے اپنے کاغذات میں ملی ہے جس میں مَیں نے خدمت و اشاعت اسلام کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں ملک کے اسلامی اخبارات خصوصاً وکیل میں یہ خبریں مشتہر ہوئیں کہ ملک جاپان میں جو کہ مثل امریکا کی طرح ایک مذہبی کانفرنس کا انعقاد ہوتا ہے اور جاپانی جس مذہب کو بعد تحقیقات کے سب سے اچھا سمجھیں گے اُسے قبول کریں گے۔ جناب حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب اور جناب شمس العلما مولانا مولوی محمد عبدالحق صاحب (صاحب تفسیر حقانی) کے مشورہ سے میں نے جاپان کا سفر اختیار کیا۔ اور شروع نومبر سنہ ۱۹۰۵ء رمضان شریف کے مہینے میں کلکتہ کے راستے سے روانہ جاپان ہوگیا۔

سفر جاپان کے مختصر حالات

اس سفر کی تیاری میں سب سے بڑی دقت یہ پیش آئی کہ چھوٹا بھائی اور بیوی بیمار تھیں۔ دوسرے گھر والوں کو یہ سفر بالکل بیکار معلوم ہوتا تھا

برابر کے دوستوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو میرے اس ارادے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہو۔ بہت سے لوگوں کو تو یقین بھی نہ آتا تھا کہ اسکی تہ میں کوئی راستی یار استبازی مضمر ہے۔ مگر میں جناب باری میں نہایت خشوع وخضوع سے دعا مانگتا رہتا تھا اور دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ میری بہترین عبادت یہ ہے کہ علوم انگریزی میں جو تھوڑی بہت واقفیت حاصل کی ہے اُسے جب موقع ملے خدمت اسلام میں صرف کروں۔ مَیں نے اس آرزو کے پورا کرنے کے لیے مزارات پر جا جا کر دعائیں مانگیں۔ جواہرالقرآن کا وظیفہ چالیس دن تک پڑھا۔ اور نوکری۔ بال بچّے داری اور تفریحات سے جو وقت بچا اُسے مطالعہ کتب میں صرف کیا۔ قوم انگریزی کی خصوصیات کا مطالعہ خاص طور پر مدنظر رکھا۔ نوکری کے سلسلہ میں دس سال تک نینی تال رہنے کا اتفاق ہوا۔ جہاں اسکی واقفیت بہم پہنچانے کے بہت موقع ملے۔ پادریوں سے ملنا۔ اُنکے گرجاؤں اور جلسوں میں جانا۔ عرصۂ دراز تک شعار رہا۔ جاپان جانے کے وقت تک میرے خیالات کچھ اس قسم کے تھے کہ مذہب کی روحانیت کو بڑی چیز اور سب کچھ سمجھتا تھا۔ انگریزی تمدن اور تہذیب میں جو باتیں اچھی ہیں اُنکا دلدادہ تھا اور موجودہ پردے کی حد سے زیادہ قیود۔ اور عورتوں کے جاہل رکھنے اور اُن سے عمدہ برتاؤ نہ کرنے کو بہت بُرا جانتا تھا اور اپنے گھر کی عملی زندگی میں ان معاملات میں ایک خاص حد تک اصلاح کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ حُسن پسندی کا مرض ابتک موجود تھا اور مجھ میں اور میرے متذکرہ بالا تفریحی مشاغل میں کوئی بیّن فرق نہ آیا تھا۔ بھلا ایسی حالت میں مجھے کوئی شخص خالص مشنری اور سچا خادم اسلام کیونکر سمجھ سکتا تھا ریاکاری میرے بس کی بات نہ تھی ورنہ میرے ایک دوست تو یہاں تک آمادہ تھے

اور یہ تجویز انھوں نے خود اپنی طرف سے مجھسے بیان کی کہ تم کو حضرت سلطان المشائخ کی سترھویں شریف کے موقعہ پر دستار باندھی جائے اور نئی روشنی کے نوجوانوں کے لیے پیر بنا دیا جائے۔

یوں تو کئی مہینے سے اخبار وکیل امرتسر اور ملک کے دوسرے اخبارات میں جاپان میں اشاعتِ اسلام کے بارے میں خبریں اور مضامین شائع ہو رہے تھے مگر وہ خاص مضمون جس نے مجھے جاپان جانے پر فوراً آمادہ کر دیا اور جس کی وجہ سے نہ میں نے رمضان شریف کا خیال کیا اور نہ بھائی اور بیوی کی بیماری کا حسب ذیل ہے:۔

از اخبار وکیل امرتسر مطبوعہ یکم نومبر ۱۹۰۵ء مطابق
۲۔ رمضان المبارک ۱۳۲۳ھ یوم چہارشنبہ صفحات ۲ و ۳

" + + + + + + + + + +

اسلام جاپان میں

عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

امریکہ کے ماہوار رسالہ "دی ورلڈ" میں مشہور امریکن سیاح مسٹر نبک روز سیاح بلاد مشرقیہ کا ایک پر زور مضمون بعنوان "جاپان میں اسلام" شائع ہوا تھا جسکا ترجمہ ہم آگے چل کر درج کرینگے۔ اسپر رسالہ مذکور کے ایڈیٹر نے جیسا کہ مسیحی مصنفوں کی بالعموم عادت ہے کچھ جلے کٹے ریمارک کیے ہیں۔ جنسے پایا جاتا ہے کہ جب سے اقصائے مشرق میں آفتاب صداقت طلوع ہونے کے آثار عیاں ہوئے ہیں

اُس وقت سے حامیان صلیب پرستی اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے اور یہ چاہتے
ہیں کہ کسی طرح اس نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا دیں۔ اور اسکی منور شعاعوں
کو اطراف عالم میں پھیلنے نہ دیں۔ لیکن وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُورِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ
ان کی صلیب کو دو ہزار سال کی مدت مدید میں اسقدر گھن لگ چکا ہے کہ اب
اس کی درستی و استحکام کسی طرح ممکن نہیں۔ چنانچہ مشرق تو مشرق خود مغرب
میں بھی اسکی طرف سے بیزاری و مایوسی پھیل چلی ہے یوروپین اقوام کے جہلاء
و عوام تو کس گنتی میں ہیں ان کی مذہبیت کو پہلے بھی سچی عیسائیت سے کون سا
بڑا تعلق تھا؟ لیکن متوسط طبقہ کے ذی ہوش لوگوں اور نیز انکے محققین و خواص
میں تو کچھ مدت سے تثلیث کی لغویت اور توحید کی وقعت و عظمت اچھی طرح گھر کرتی
جاتی ہے۔ پوپوں اور پادریوں نے بائبل مقدس میں آئے دن ترمیم در ترمیم
اور تحریف در تحریف کر کے ہر چند کوشش کی کہ اس بھول بھلیاں کو زمانے کی
رفتار اور حوادث روزگار سے گزند نہ پہنچے۔ لیکن باوجود ان کی حیرت انگیز بیعدیل
مساعی اور بیشمار مصارف کے جن کا بار محض تحفظ دین کی خاطر اُٹھایا جاتا ہے۔
افسوس کہ **طلسم صلیب** اس تہذیب و تحقیق کے زمانے میں کسی طرح......
.... لیکن حیف ہے ان لوگوں کی عقل پر جو اپنے گھر
کی حالت سے بے خبر جہاں عملی طور پر صلیب مذہبی کا گویا خاتمہ ہی ہو رہا ہے
دنیا کی دوسری جاہل تو جاہل شائستہ۔ فرزانہ و بیدار مغز اور محقق طبع قوموں
پر بھی ابتک اُن ہی عقائد باطلہ کو پیش کیے جاتے ہیں جنھیں عقل سلیم مدتوں سے
مردود و مسترد ٹھہرا چکی ہے اور جن کا نقش خود ان کے بیشمار سمجھدار ہمقوموں
کے دل سے مٹ چکا ہے۔ جاپان میں تبلیغ و اشاعت نصرانیت کے لیے
کمتی فوج کا مشن خاص اہتمام سے بھیجا جانا اسی لیے تجویز ہوا کہ جاپانی

ایک ہونہار قوم ہے - اور نے اقبال دنیا میں حیرت انگیز و عالمگیر عزت و شہرت حاصل کر چکی ہے اُسے بھی تثلیث اور صلیب پرستی کی دعوت دی جائے - تا کہ صلیب پرستوں کی جمعیت میں جن کا سلسلہ دنیا میں پہلے ہی دور تک پھیلا ہوا ہے لاکھوں کروڑوں کا اور اضافہ ہو جائے - لیکن یہ نہیں سوچتے کہ جاپانی جہاں مہذب ہونہار اور مترقی ہیں اسکے ساتھ ہی کچھ عقل و خرد بھی رکھتے ہیں بلکہ ان کی اس ترقی و عظمت کا موجب ہی انکی یہ صفات ہیں - پھر کیونکر سمجھ میں آسکتا ہے کہ وہ موجودہ مسیحیوں کے مجہولہ معتقدات پر اندھے بن کر صاد کریں گے - اور آمنا و صدقنا کہہ کر ان ہی کے زمرہ میں شامل ہو جائیں گے - ع -

ایں خیال ست و محال است و جنوں

برخلاف ازیں جاپان میں اسلام کا رفتہ رفتہ اس سرے سے اُس سرے تک پھیل جانا اب بفضلہ قریباً یقینی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ وہ دراصل ایک روشن خیال اور حق جو قوم ہے - اسکے خواص میں دین متین اسلام سے ایک طرح کا اُنس اور اس کی جانب میلان عام پیدا ہو جاتا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے بھی بتفصیل بیان کر چکے ہیں جاپانیوں کی ایسوسی ایشن متعلقہ تحقیق مذاہب بھی اسلام کی پرکھ پڑتال پر متوجہ ہو گئی ہے -

بہرحال یہاں ہم پہلے اصل آرٹیکل کا ماحصل درج کرتے ہیں - پھر ایڈیٹر وی ورلڈ کی رائے ازاں بعد اپنی طرف سے کچھ ریمارک کریں گے -

مسٹر روزبینک لکھتے ہیں :-

" باخبر لوگوں کو معلوم ہے کہ مذہب اسلام نے موسوی اور عیسوی مذاہب کے

[illegible]

اصلی حسن افزا صابون

[illegible] پیدا کرنے کی بے نظیر دوا ہے دیسی ولایتی گلاب کیوڑا نرگس [illegible]
[illegible] سے یہ صابون عجب تیار کیا جاتا ہے جو حسن کو دوبالا کرتا [illegible]
[illegible] ملائمت پیدا کرتا ہے جلد کی تمام چھائیاں کیل مہاسے داغ دھبے پھوڑے
پھنسیاں اسکے استعمال سے زائل ہو جاتے ہیں جلد کو صاف ملائم کر دیتا ہے اور تمام
[illegible] کر نہانے سے بدن گلاب کے پھول کے مانند ہو جاتی ہے اور ہر وقت بدن
سے بھینی بھینی خوشبو آتی ہے مستورات کی خوبصورتی کا خاص طور سے معاون ہے
[illegible] ٹکیس تین ٹکیہ مع صابن دانی عہ

روغن دل بہار گیسو

[illegible] مستانہ خوشبو عقل کو مست کر دیتی ہے۔ اسکے استعمال سے بال لمبے اور ریشم کی طرح
[illegible] یک سیاہ ہو جاتے ہیں درد سر رفع ہوتا ہے فی شیشی عہ

خوشبودار سپاریاں

یہ سپاریاں دو چار پان میں رکھ کر کھانے سے منہ میں بیحد خوشبو پیدا کر دیتی ہیں گلے کو
[illegible] صاف کرتی ہیں۔ ۵ قسم ہیں فی ڈبیہ ۲ فی درجن عہ

خضاب لاجواب

[illegible] خضاب بغیر کسی تکلیف کے بالوں کو سیاہ کر دیتا ہے جلد پر کسی قسم کا داغ دھبہ
[illegible] فی شیشی مع برش ایک روپیہ۔ دواخانہ کی فہرست مفت منگا لیجئے۔

المشتہر حکیم محمد یعقوب خان مالک دواخانہ نورتن علی بازار فراش خانہ